سلسلۂ مطبوعاتِ اِدارۂ ادب و تنقید، لاہور۔ نمبر ۱۹

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جلوہ ہائے صد رنگ

[خاکے]

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادب و تنقید، لاہور — نمبر ۱۹

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جلوہ ہائے صد رنگ

[خاکے]

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

جلوہ ہائے صد رنگ

تصنیف : جلوہ ہائے صد رنگ
مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
طابع : ظفر سنز پرنٹرز، کوپر روڈ، لاہور
سرورق : سید انور حسین شاہ نفیس رقم
کتابت : محمد ابراہیم خوش نویس
تاریخ اشاعت : جون ۱۹۸۵ء

یارِ دیرینہ ——— حبیبِ وفا شیوہ

○

آغا حسن عابدی

کے نام

○

حُسن کی شرح غیر ممکن ہے — بند ہو بند اے لبِ گفتار
ساحلِ بحر پر حبابوں کا — چاہتا تھا کہ آج گوندھوں ہار
اور کلی سے اُٹھانے بیٹھا تھا — شبنمِ تازہ کے دُرِ شہوار
نہ تو وہ ہو سکا نہ یہ صد حیف — ٹوٹ جا خامۂ فضول نگار
نطق کے بس میں آ نہیں سکتی
بوئے گل، تابِ ماہ، طلعتِ یار

جوش ملیح آبادی

عبادت

فہرست

پیش لفظ

میں ایک کم آمیز آدمی ہوں۔

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں مجھے اس عہد کے بڑے بڑے سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں اور مخلص انسانوں سے قریب رہنے کے مواقع ملے اور ان سب کی صحبتوں میں کچھ ایسے تجربات ہوئے جن کا دوسروں تک پہنچانا میں نے ضروری خیال کیا۔

اسی مقصد سے میں نے ان شخصیتوں کے خاکے لکھے جن میں سے کچھ شائع ہو چکے ہیں، کچھ اب شائع ہو رہے ہیں، اور کچھ آئندہ شائع ہوں گے۔

اس سے قبل بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں کے خاکے "رہ نوردانِ شوق" کے نام سے اور صوفی تبسم، مجاز، میراجی، محمد حسن عسکری اور ناصر کاظمی کے خاکے "آوارگانِ عشق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اور انھیں دلچسپی سے پڑھا گیا ہے۔

اس کتاب میں جو اس وقت "جلوہ ہائے صد رنگ" کے نام سے شائع ہو رہی ہے
شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، پروفیسر حمید احمد خاں، فیض صاحب
بلونت سنگھ اور میر صاحب کی دلکش اور پہلو دار شخصیتوں کے دلچسپ خاکے ہیں۔

یہ خاکے دلچسپ اس وجہ سے ہیں کہ ان میں اس عہد کی بعض دلکش اور رنگا رنگ
شخصیتوں کی ایسی تصویر کشی ہے، جس میں ہماری معاشرتی اور تہذیبی روایت کا پس منظر
بھی بے نقاب نظر آتا ہے۔

لاہور
۲۵ مئی ۱۹۸۵ء

عبادت بریلوی

شاعر انقلاب
حضرت جوش ملیح آبادی

یہ بات بظاہر تو عجیب و غریب ہے لیکن ہے یہ ایک حقیقت کہ اگر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کو دور سے دیکھئے تو ان کی بارعب اور پُر وقار شخصیت دل میں ایک طرح کے خوف اور ڈر کو پیدا کرتی تھی اور اگر ان کے حلقۂ خاص میں شامل ہو کر ان سے قربت حاصل کر لیجئے تو ان کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کی گھلاوٹ اور نرمی حلاوٹ اور شیرینی پر پیار آنے لگتا تھا۔

میں انہیں ایک زمانے میں برسوں تک دور سے دیکھتا رہا۔ اسی لیے طالب علمی کے زمانے میں بھی ان کی شخصیت کا رعب مجھ پر چھایا رہا۔ ان سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی لیکن میں ان سے مل نہیں سکا۔ میں نے ان سے ملنے اور ملاقات کرنے کے پروگرام تو بنائے لیکن ایک عجیب سے خوف اور ڈر نے ہمیشہ میرا راستہ روک لیا اور میں ان سے نہیں مل سکا ہوں۔ لیکن اپنی طالب علمی کے زمانے کے بعد جب میں اُن کے حلقہ احباب میں داخل ہو کر ان سے قریب ہو گیا تو اِس ڈر اور خوف کی جگہ ایک موانست اور

محبت بنے لے لی۔ ہر ملاقات میں میں نے ہمیشہ ان کی شخصیت کو حد درجہ دلکش اور دلآویز پایا اور ان سے ملنے میں ہمیشہ ایک لذت سی محسوس کی اور آج میں اس مؤانست اور محبت کو اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس نے مجھے شاعرِ انقلاب کی رنگارنگ شخصیت کے ان گنت پہلوؤں سے روشناس ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے انہیں پہلی بار لکھنؤ کے قیصر باغ میں دیکھا تھا۔ اس وقت میں غالباً آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ قیصر باغ سے امین آباد کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ لڑکپن ہی تھا، قیصر باغ سے امین آباد تک میں ان کے پیچھے پیچھے صرف اس خیال سے گیا تھا کہ کسی جگہ موقع پا کر ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ بس خود ہی اپنا تعارف کرا دوں گا، اور اس طرح ملاقات کی تقریب نکل آئے گی۔ وہ امین آباد پہنچ کر ایک ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ اور میں سڑک پر کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ جھجھک میری راہوں میں حائل رہی اور میں ان سے نہ مل سکا۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لاٹوش روڈ کے ایک مشاعرے میں اپنی نظم "جنگل کی شہزادی" سنا رہے ہیں۔ وہ نظم پڑھ چکے، رباعیاں سنا چکے، مشاعرہ ختم ہو گیا۔ لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس دفعہ پھر ان سے ملنے کی ہمت نہیں پڑی اور اسی طرح نہ جانے کتنے ہی مواقع ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ان کو دیکھا لیکن ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ ان سے ملنے کو جی چاہا لیکن ایک زمانے تک یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی، وہ لکھنؤ آتے رہے۔ میں انہیں دیکھتا رہا، مشاعروں اور مختلف ادبی محفلوں میں کلام سننے کا موقع بھی ملتا رہا لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ بس ایک طرح کا حجاب درمیان میں حائل رہا۔

جوش صاحب کو لکھنؤ سے عشق تھا۔ لکھنؤ کی ہر چیز کے وہ والا و شیدا تھے۔ اس زمانے میں رہتے تو وہ دلّی میں تھے لیکن اکثر دلی سے ان کا لکھنؤ آنا ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک

دفعہ ملاقات کی صورت نکل ہی آئی۔ میں ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے جو جوش صاحب سے وطنی نسبت رکھتے تھے۔ انھوں نے ملاقات کی صورت نکالی۔ وہ جوش صاحب سے وقت۔ مقرر کر کے آئے اور ہم دونوں مقررہ وقت۔ پر ان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ ایک بڑے سے کمرے میں صوفے کی بجائے ایک صاحب۔ فرش پر بیٹھے ہیں۔ بھاری بھرکم جسم، دراز قد، سُرخ سفید رنگ، چہرے پر وجاہت، اور شرافت، تہذیب کا صاف شفاف کرتہ اور علی گڑھ کٹ کا تنگ۔ پائنچوں کا پاجامہ زیب تن، سامنے پانوں کی ڈبیہ، قریب ہی اُگالدان، آس پاس کتابیں اور کاغذات ——— یہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی تھے، جن کو دیکھنے اور جن سے ملنے کی مجھے ایک زمانے سے آرزو تھی، ہمیں دیکھتے ہی جوش صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت ہی خندہ پیشانی سے معانقہ کیا۔ اس طرح جیسے ہم لوگوں کو برسوں سے جانتے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مزاج پوچھا۔ حالات دریافت کیے۔ بات میں سے بات نکلی تو ملیح آباد، شاہجہان پور، رامپور اور قائم گنج کے پٹھان خاندانوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کیونکہ اس وقت پٹھان ہونا ہی ہم دونوں کے درمیان مشترک تھا۔ پھر شعر و شاعری کی باتیں ہوئیں، یونیورسٹی کے ادبی ماحول اور لکھنؤ کی قدیم ادبی صحبتوں کا ذکر رہا۔ اور اس طرح اَن گنت موضوعات پر ہم سے بات چیت کرتے رہے۔ ان باتوں میں ماضی کی پرانی یادیں تھیں۔ حال کے معاملات و مسائل تھے۔ مستقبل کے خواب تھے۔ لیکن ان سب پر بات کرنے میں جوش صاحب کے ہاں ایک بذلہ سنجی تھی جس نے اُن کی ہر بات کو لطیفہ بنا دیا تھا۔ لیکن ان لطیفوں سے ماحول کے وقار اور رکھ رکھاؤ کو ٹھیس نہیں لگتی تھی بلکہ اس فضا میں خاصا لیے دیئے رہنے والا انداز تھا۔ کئی گھنٹے کی اس دلچسپ ملاقات کے بعد ہم لوگ جوش صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔

جوش صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں اس ملاقات پر بہت خوش تھا۔

کیونکہ آج میں ایک عظیم، ہمہ گیر اور رنگا رنگ شخصیت سے ملا تھا۔ اور اس شخصیت نے اپنے رویے اور طرز عمل سے وہ جو ایک مانوس فضا پیدا کی تھی، اس نے میرے لیے آئندہ بہت سی ملاقاتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد آج تک میں نے جوش صاحب سے بے شمار ملاقاتیں کی ہیں، اور ہر ملاقات میں وہ موانست، جس کا احساس مجھے پہلے دن بھی ہوا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ جوش صاحب کے اخلاق کو میں نے روز اول ہی دیکھا ہے۔ درحقیقت یہ موانست ان کے اسی غیر معمولی اخلاق ہی کا نتیجہ تھی۔ جس کی وجہ سے کوئی بھی ملنے والا ان کے سامنے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔

میں نے بھی مختلف ملاقاتوں میں یہ محسوس کیا کہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اخلاق اور شائستگی کا مجسمہ تھے۔ بے شمار لوگ ان سے ملتے تھے۔ وہ ہر ایک کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے تھے، اور ایک لمحے کو بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ ظاہر ہے اتنے بہت سے لوگوں کو یاد رکھنا اور انہیں پہچاننا آسان بات نہیں۔ وہ ان ملنے والوں میں سے اکثر کو نہیں پہچانتے تھے۔ لیکن ملتے وقت احساس سب کو یہی دلاتے تھے گویا انہوں نے ان کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ جب بھی کوئی ان سے ملنے آتا تو کھڑے ہو کر اس کو گلے لگاتے۔ پھر پوچھتے، "کہیے صاحب مزاج تو اچھا ہے؟ کہاں رہے، کیسے رہے؟ کیا کر رہے ہیں؟ قیام کہاں ہے؟ زمانے سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟" اس سوال و جواب سے تھوڑی سی معلومات انہیں ہو تی جاتی تھی اور پھر اس معلومات کو سامنے رکھ کر وہ مزید ذاتی سے سوالات بنا لیتے تھے۔ اس طرح ملنے والا یہ سمجھتا تھا کہ جوش صاحب کو اس کے تمام حالات کا علم ہے۔ اور اس لیے وہ ان کے سامنے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔ برخلاف اس کے ایسے مواقع پر تو جوش صاحب اس کے سب سے بڑے مونس و غمخوار بن جاتے تھے۔ حالانکہ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد ان سے پوچھیے،

کہ یہ کون صاحب تھے، تو یہی جواب ملتا کہ "بھئی، بالکل یاد نہیں۔ میں انہیں پہچان نہ سکا"

ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے!

میں ایک دن جوش صاحب کے پاس دلی میں علی پور روڈ پر 'آجکل' کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان ملنے آگئے۔ جوش صاحب نے انہیں ایک ذرا دیکھا۔ اور پھر فوراً کہا۔

"آیئے حضرت، تشریف لایئے۔"

"حاضر ہوتا ہوں"۔

"ایک زمانے کے بعد آپ کا دیدار ہوا"۔

"کیا عرض کروں، میں پچھلے دنوں کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان سے باہر چلا گیا تھا"۔

"لیکن حضرت! یہ آپ، چُپ، چُپاتے یہاں سے باہر چلے جاتے ہیں؟" نہ کوئی خیر نہ خبر، کم از کم اطلاع تو دی ہوتی"۔

"کیا عرض کروں بات ہی کچھ ایسی تھی"۔

"لیکن صاحب، کم از کم خط تو لکھا ہوتا!"

"جی ہاں، یہ میری غلطی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ بہت مصروف اور پریشان رہا"۔

"اچھا آپ کے والد صاحب تو اچھی طرح ہیں؟"

"بفضلہ خیریت سے ہیں؟"

"اور ہاں آپ نے شادی کرلی یا نہیں"؟

"بس اب تیاری ہو رہی ہے۔ والدہ کا اصرار ہے، سوچتا ہوں کر ہی ڈالوں"۔

"جی ہاں! والدہ کی بات کو آپ بھلا کس طرح ٹال سکتے ہیں"؟

"اچھا مکان وغیرہ تو ٹھیک ٹھاک ہے"؟

"ہے تو ٹھیک لیکن مقدمہ بازی ہو رہی ہے"۔

"بڑی لعنت ہے صاحب! یہ مقدمہ بازی۔ میں تو اپنی ساری جائیداد ان عدالتوں

اور کچہریوں کی نذر کر چکا ہوں"۔

"اچھا کب تک قیام رہے گا؟"

"اب تو مستقل طور پر یہیں رہنے کا ارادہ ہے"۔

"تو پھر کبھی کبھی ملاقات تو ہونا ہی چاہیے۔ آخر یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ایک شہر میں رہتے ہیں اور ملاقات نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ضرور آیئے"۔

غرض اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی باتوں کے بعد جب وہ صاحب رخصت ہوئے تو میں نے پوچھا۔

"جوش صاحب! یہ کون صاحب تھے؟"

جوش صاحب کہنے لگے۔ "بھئی، خدا جانے کون صاحب تھے! میں انہیں پہچان نہ سکا۔ کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن اب کچھ یاد نہیں آتا"۔

میں نے کہا "لیکن آپ باتیں تو اس طرح کر رہے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہے"۔

کہنے لگے "جی ہاں خاصی گاڑھی چھن رہی تھی"۔

مجھے اس فقرے پر ہنسی آگئی۔ جوش صاحب بھی ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا "جوش صاحب! آپ کمال کرتے ہیں۔ وہ شخص سمجھتا ہو گا کہ آپ نے اس کو پہچان لیا ہے اور آپ اس کے حالات سے بخوبی واقف ہیں"۔

جوش صاحب کہنے لگے، "کسی شخص کو یہ احساس دلانا کہ اُسے پہچانا نہیں گیا ہے، میرے نزدیک بہت بڑی بداخلاقی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جس سے وہ ملنے آیا، اُس نے ملنے والے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور وہ اس کو بھول گیا ہے"۔ —— اس لیے جوش صاحب کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ انہوں نے ملنے والے کو نہیں پہچانا ہے۔ بلکہ جوش صاحب تو یہاں تک کرتے تھے کہ کوئی صاحب آئے اور انہوں نے آتے ہی کہا۔ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں، تو وہ اس کے جواب میں ہمیشہ کہتے۔ "نہیں صاحب،

بخوبی پہچان لیا۔ بھلا آپ کو کون بھول سکتا ہے"؛ حالانکہ وہ ان کے بارے میں مطلق نہیں جانتے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں۔

اس سے ان کی خوش اخلاقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہر وقت وہ اپنے اقوال اور افعال سے اس اخلاق کا اور شائستگی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی یہ خوش اخلاقی تکلف کے حدود میں داخل ہوجاتی تھی۔

دلّی میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں 'آجکل' کے دفتر میں ان سے ملنے گیا ہوں۔ دو ایک گھنٹے بیٹھ کر رخصت چاہی ہے۔ لیکن انہوں نے پوچھا ہے "آپ کالج ہی کی طرف جائیں گے نا"؟

میں نے کہا "جی ہاں! جانا تو اسی طرف ہے"۔

"تو پھر آیئے گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ بھئی میں بھی اسی طرف جارہا ہوں"!

اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنی بیوک کار میں بٹھالیا ہے۔ اور ٹھیک اینگلو عربک کالج کے سامنے اجمیری دروازے پر لاکر اُتارا ہے۔ اور اتار کر پھر گھر واپس گئے ہیں۔

اس اخلاق کے نمونے اب کہاں مل سکتے ہیں؟

شاعر انقلاب کو یہ خوش اخلاقی ورثے میں ملی تھی۔ وہ نسلاً آفریدی پٹھان تھے۔ اور پٹھان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مہمان پر جان دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اودھ کے اس ماحول کو بھی دخل تھا جس کے سائے میں انہوں نے پرورش پائی اور جہاں خوش اخلاقی تکلفات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ویسے وہ خود ان تکلفات کے قائل نہیں تھے۔ کیونکہ بے تکلفی ان کے مزاج کا جُز تھی۔ پھر بھی اُن کی، خوش اخلاقی ان کے یہاں کہیں کہیں تکلف کو پیدا ضرور کردیتی تھی البتہ ان کا یہ تکلف تمام تر مصنوعی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو تکلف کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

جوش صاحب کو آداب کا خیال ہمیشہ رہتا تھا۔ وضعداری کو وہ بڑی اہمیت دیتے

تھے، اور اکثر پُرانی وضعداریوں کے واقعات بیان کرتے تھے۔

ایک دن مشاعروں کے آداب اور وضعداریوں کا ذکر چھڑ گیا۔ جوش صاحب کہنے لگے "لکھنؤ میں ایک شاعر بنّن صاحب بلیغ تھے۔ مشاعرے میں بیٹھے تھے، شعراء کلام سُنا رہے تھے۔ اتفاقاً اُن کے جسم پر ایک کھنکھجورہ چڑھ گیا اور چپک گیا۔ سخت تکلیف ہوئی لیکن ضبط کرتے رہے اور آداب کے مطابق شاعروں کو داد دیتے رہے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو احباب نے دوسرے کمرے میں لے جا کر انگرکھا اور کرتا اُتارا تو دیکھا پیٹھ پر کھنکھجورہ چمٹا ہوا ہے۔ گرم چمٹے سے اس کو الگ کیا گیا، تب اُن کی جان میں جان آئی" ــــــــ

جوش صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اور وہ مجھے حد درجہ حساس اور جذباتی انسان نظر آئے ہیں۔ خاص طور پر احباب کے معاملے میں تو وہ بے حد حساس اور جذباتی تھے۔ کبھی وہ سفر پر جاتے ہوں اور احباب کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہو تو ان کی کیفیت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ بس آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے ورنہ ان کی ہر بات اور ہر انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ان پر رقت طاری ہو اور بس اب آنکھیں ڈبڈبانے ہی والی ہیں۔ اگر کسی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو کہیں گے "نہیں صاحب! معانقہ کریں گے گلے ملیں گے۔ خدا جانے کب ملاقات ہو، کس عالم میں ملاقات ہو؟ مشیت، ہم سب کی گھات میں ہے، اور یہ کہہ کر ہر ایک کو گلے سے لگائیں گے۔ بار بار فرطِ شوق سے بھینچیں گے اور دیر تک یہی کیفیت رہے گی۔ ان سب باتوں کے بغیر ان کے یہاں رخصت ہونے کا تصور ہی نہیں تھا۔ جوش صاحب کی باتیں محض رسمی اور بناوٹی اور دکھاوے کی نہیں ہوتی تھیں۔ اس عالم میں ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز سے بے اندازہ خلوص ٹپکتا تھا اور بے پایاں صداقت مترشح ہوتی تھی۔ ان کے دوستوں میں سے اگر خدانخواستہ کبھی کسی کو کوئی

تکلیف۔ پہنچ جائے تو بس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جوش صاحب انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ان پر ایک کرب کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا اور بے چین اور پریشان ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے اس اضطراب کو دیکھ کر دستوں پر بھی اضطراب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور دوستوں ہی پر کیا منحصر ہے وہ کسی کو بھی تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر انسان کی تکلیف انہیں اپنی تکلیف معلوم ہوتی تھی۔

دلّی کے دوران قیام میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجاز لکھنو سے آئے تو میرے پاس اینگلو عربک کالج میں ٹھہرے۔ ایک دن تو میرے یہاں رہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ جوش صاحب کے یہاں جا رہا ہوں، اپنا سامان چھوڑ چھاڑ اس طرح غائب ہوئے کہ کئی دن تک خبر ہی نہیں لی۔ میں چونکہ ان کے مزاج سے واقف تھا، اس لیے مجھے ان کی اس حرکت سے کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ جو بھی پوچھتا میں یہی کہہ دیتا کہ سامان تو ان کا یہاں پڑا ہے۔ لیکن جوش صاحب کے یہاں چلے گئے ہیں۔ وہاں مفت کی پیتے ہوں گے اور اسی وجہ سے ان کا جی وہاں لگ گیا ہوگا۔ مجاز کو گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ میری طبیعت اس دن کچھ خراب تھی۔ اس لیے چاروں طرف سے دروازے بند کر کے بستر میں لیٹ گیا تھا۔ دن کے کوئی تین بجے ہوں گے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا کوئی طالب علم ہوگا۔ ایک دو بار کھٹکھٹانے کے بعد چلا جائے گا۔ لیکن دستک کی آواز برابر آتی رہی۔ مستقل اور مسلسل۔ تب مجھے یہ خیال ہوا کہ ضرور کوئی صاحب کسی اہم کام سے آئے ہیں۔ اس لیے اٹھ کر دروازہ کھول دینا چاہیئے۔

میں نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ جوش صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ پسینے میں شرابور، وہ ہانپتے کانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان پر ایک عجیب گھبراہٹ کا عالم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا "مجاز مر گیا"۔

یہ سن کر تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گھگھی بندھ

گئی۔ میری چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد نے تفصیل سنانی شروع کی۔ انہوں نے بتایا کہ نہ جانے کس نے ابھی ابھی جوش صاحب کو فون پر یہ خبر دی ہے۔ خبر غلط بھی ہو سکتی ہے۔ خدا کرے غلط ہو!

خیر میں نے جوش صاحب کی حالت غیر دیکھ کر انہیں تو ایک کرسی پر بٹھایا اور عرش سے مخاطب ہو کر کہا کہ یقیناً یہ خبر غلط ہے، کسی نے شرارت کی ہے، صرف اس خیال سے کہ جوش صاحب کو تھوڑی سی تسلی ہو جائے اور اُن کی پریشانی دور ہو۔ پھر انہیں اس طرح سمجھانا شروع کیا کہ "کہیں شراب زیادہ پی لی ہو گی، بے ہوش ہو گیا ہو گا۔ لوگوں نے سوچا ہو گا آپ کو اطلاع دے دی جائے۔ آپ تو مجاز کو جانتے ہی ہیں"۔

باتیں تو میں اس قسم کی کر رہا تھا۔ لیکن دل سے خدا ہی کو خبر تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا خیر، یہ باتیں سن کر جوش صاحب کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ پھر میں نے کچھ طالب علموں کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کی کہ کسی نہ کسی طرح مجاز کی خیر خبر معلوم کریں اور صیح معلومات مجھ تک بہم پہنچائیں۔

شام ہونے لگی تھی، اس لیے جوش صاحب سے میں نے کہا کہ "آپ تو اب گھر جا کر آرام کیجئے، مجاز پہنچ جائے گا"۔

یہ باتیں سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ورنہ اس سے قبل تو ان پر ایک عجیب پریشانی کا عالم طاری تھا اور ہوش اُڑے ہوئے تھے۔

جوش صاحب تو میرے اصرار پر طوعاً و کرہاً گھر چلے گئے۔ اور ادھر طالب علموں نے مجاز کو تلاش کرنا شروع کیا اور ساری دِلّی چھان ڈالی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ بالآخر بڑی تلاش اور جستجو کے بعد رات گئے کہیں سے یہ خبر ملی کہ ایک جگہ اس نے بہت شراب پی لی تھی اور دو دن سے وہیں پڑا ہوا ہے۔ میں نے رات ہی کو جوش صاحب کو یہ خوش خبری بھیجی۔ جس وقت میرا خط پہنچا۔ اسی وقت بعض لوگوں نے مجاز کو بھی جوش صاحب کے یہاں

پہنچا دیا۔ دوسرے دن جوش صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا۔

"حضرت، خوش خبری کا شکریہ قبول فرمائیے"

صبح جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مردود مجاز آزاد کے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے بہت ڈانٹا پھٹکارا۔ اور اس ہدایت کے ساتھ اپنے گھر روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر وہ غسل کرے اور کھانا کھائے۔

معلوم نہیں کس ابن زیاد نے اس کی موت کا فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیکی کی توفیق دے! اس کے اس قاتلانہ فعل کو معاف کرتا ہوں۔ ہلاک کر دیا مجھے اس بدبخت کے فون نے۔

نیاز مند

جوش

اس واقعے سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب اپنے دوستوں سے بلا کی محبت کرتے ہیں اور اُن کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔

جوش صاحب کو احباب سے ملنے میں جو مسرّت حاصل ہوتی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے بہترین لمحے وہی ہوتے تھے جب وہ احباب کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ اسی لیے ہر صحبت کی یاد ان کے دل میں ایک داغ بن جاتی تھی۔ ان کی شاعری کا ایک خاصا حصّہ اسی قسم کے جذبات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ خطوں میں بھی اکثر اس کیفیت کا تذکرہ کرتے تھے۔ ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں :۔

"اکثر آپ یاد آتے ہیں۔ اب تو یادوں کا موسم ہے۔ مستقبل سے کوئی توقع نہیں۔ حال، زبوں حال ہے۔ اس لیے جو کچھ ہے وہ ماضی ہے، برسی ہوئی گھٹائیں کیوں کر گرجتی برستی ہیں، یہ مجھ سے پوچھئے اور بھولی بسری صحبتیں کیوں کر گونجتی ہیں، یہ بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ کبھی کبھی یاد کرتے رہیے۔ عمر کا پیمانہ چھلکا ہی چاہتا ہے۔

بیار بادہ کہ مینائے عمر لبریز است
مریض رادم آخر چہ جائے پرہیز است

نیاز شعار

وہی جوش بادہ گسار

شاید ہی کوئی خط ایسا ہوتا ہو جس میں جوش صاحب احباب کو اس قسم کی باتیں نہ لکھتے ہوں۔ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہو جب جوش صاحب اس طرح کی باتیں نہ کرتے ہوں، ان پر احباب سے بچھڑنے کا خیال، بچھڑنے سے پہلے ہی طاری ہو جاتا تھا، اور اس میں ان کے حد درجہ حساس اور جذباتی ہونے کو دخل تھا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اُن کے اس انداز میں کتنی انسانیت اور محبت تھی۔

اسی انسانیت اور محبت کا یہ اثر ہے کہ جوش صاحب احباب کی خاطر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ کسی دوست پر کوئی وقت آن پڑے تو جوش صاحب اس کے لیے ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ دوست کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو جوش صاحب اس کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔ دوستوں کے لیے یا دوستوں کا واسطہ اور حوالہ دے کر ان سے سب کچھ کرایا جا سکتا تھا۔ جب کوئی ایسا موقع آتا تو جوش صاحب میں ایک نئی زندگی بیدار ہو جاتی تھی۔ تساہلی کو وہ بالائے طاق رکھ کر میدان میں کُود پڑتے تھے اور ہر میدان کو سر کرنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تقسیم ہند کے چند سال بعد مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری کو حکومت بمبئی نے اشتعال انگیز سیاسی تقریریں کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا چنانچہ کئی مہینے انہیں جیل میں گزارنے پڑے۔

جوش صاحب کو بھی بعض احباب نے یہ خبر پہنچائی۔ کہنے لگے "اچھا تو اب ادیب اور شاعر بھی گرفتار کیے جانے لگے۔ یہ کیا اندھیر ہے۔ کیا مجھے اس سلسلے میں پنڈت جی

(پنڈت جواہر لال نہرو) سے ملنا چاہیئے؟ احباب نے شہ دی اور کہا "اس سے زیادہ اہم معاملہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ضرور ملنے کی ضرورت ہے۔

بس جوش صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے اور کہا "کیوں صاحب! اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کر کے قید کیا جانے لگا ہے"۔ یہ کیسی اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ کیا آپ کی حکومت میں یہ بھی ہوگا؟ کیا آزادی اسی لیے ملی ہے"؟

غرض جوش صاحب نے پنڈت جی سے اس طرح کی بہت سی باتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ جوش صاحب کی اس قسم کی باتیں سُن کر مسکراتے رہے۔ اور یہی کہا کہ "جوش صاحب آپ اطمینان رکھیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کیجیے"۔

تھوڑے ہی عرصے بعد سردار جعفری کو چھوڑ دیا گیا غرض یہ کہ احباب جوش صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہیں۔ احباب کے لیے تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

یہ پہلو ان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف تھا۔ جوش صاحب محبت کے آدمی تھے۔ وہ صحیح معنوں میں عظیم انسان تھے۔ انسانیت کا خیال اور احساس ان کی شخصیت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ کرتے تھے، جو کچھ بھی سوچتے تھے، جو کچھ بھی ان کا مطمح نظر ہوتا تھا سب کا محرک ان کی یہی انسانیت اور انسان دوستی ہوتی تھی۔ جوش صاحب نے اسی انسانیت کے گیت گائے ہیں۔ یہی ان کا فلسفۂ حیات ہے۔ یہی ان کا مذہب ہے۔ یہی ان کا نصب العین اور نظریہ حیات ہے۔ یہی محور ہے جس کے گرد ان کی زندگی کا چاک گھومتا تھا۔ اسی لیے ان کی انسانیت اور انسان دوستی کے مفہوم میں ایک وسعت اور ایک گہرائی ہے، ایک تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ حیات و

کائنات کے تمام پہلوؤں کا اس نے احاطہ کرلیا ہے۔ اور وہ جوش صاحب کی زندگی پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ انسانیت ان کے نزدیک زندگی ہے، اور زندگی انسانیت!

شاعر انقلاب نے ریاست کی فضا اور امارت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ساری زندگی وہ امیروں اور رئیسوں کی طرح رہے۔ اس لیے آرام اور راحت کا خیال ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ لذت پرستی اور تعیش پسندی انہیں ورثے میں ملی۔ چنانچہ وہ اپنی ان عادتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوش باشی، لذت اور تعیش کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے اور بعض اوقات تو اس سلسلے میں اپنے حدود سے باہر بھی نکل جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بے راہ روی ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتی تھی جس کو پرانے امراء اور روساء نے اپنا شیوا بنا لیا تھا۔

جوش صاحب کام کرتے تھے۔ محنت اور جفاکشی سے گھبراتے نہیں تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے تھے جو اُن کے مزاج کے خلاف اور طبیعت کے منافی ہو۔ وہ اودھ کے ایک تعلقہ دار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن ان کی زندگی میں کوئی ایسی بے راہروی نہیں تھی جو انہیں ذہنی یا جذباتی اعتبار سے ابنارمل ثابت کرے۔ وہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک عام انسان کی طرح زندگی کے بارے میں نارمل اور صحت مندانہ رویّہ رکھتے تھے۔ لذت اور تعیش کا خیال ان کے مزاج میں ضرور موجود تھا لیکن اس معاملے میں بھی وہ انتہا پسند نہیں تھے۔ اور انتہا پسند نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں لذت اور تعیش کا خیال ہمیشہ اپنی حدود میں رہتا تھا۔ ان کی لذت پرستی اور تعیش پسندی بس یہی تھی کہ وہ عورت اور شراب کے شیدائی تھے، عورت ان کی نزدیک ایک سحر ہے اور اس کے بغیر زندگی میں رس اور رعنائی کا وجود نہیں ہوتا۔ زندگی عورت کے بغیر بے کیف ہے، بے رنگ و بو ہے، انسان کی تکمیل عورت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اسی خیال نے انہیں صنف لطیف کا پجاری بنایا۔ ان سے اپنے

حسن کی پرستش کرائی۔ وہ اس کی ہستی میں کھو گئے، اس کی رعنائیوں میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اسی کیفیت نے ان سے خود بقول اُن کے سترہ عشق کرائے۔ ایک انسان ایک زندگی میں سترہ عشق کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال ہے لیکن جوش صاحب نے سترہ عشق کیے ہیں، سترہواں عشق تو جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے، وہ تھا جو انہوں نے بمبئی میں چوپاٹی کے ساحل پر کیا تھا اور جس کی یادگار ان کی نہایت ہی خوبصورت نظم "تو اگر واپس نہ آتی" ہے یہ نظم شاعری اور خصوصاً شاعرانہ فن کاری کا شاہکار ہے۔ میرا خیال ہے کہ دُنیا کی شاعری میں کم ایسی خوبصورت نظمیں ملیں گی۔ یہ نظم کیا ہے؟ افسانہ بھی ہے۔ ڈراما بھی، مصوری بھی ہے موسیقی بھی۔ جوش صاحب نے تمام فنونِ لطیفہ کی بنیادی خصوصیات کو اس نظم میں سمو دیا ہے۔ تخیل کی بلندی اس میں اپنے کمال پر نظر آتی ہے جس کی بدولت یہ نظم ان گنت تصویروں کا ایک نہایت ہی حسین اور جاذب نظر مرقع بن گئی ہے۔ کیسی عجیب نظم ہے ے

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

ہاتھ آ جاتا اگر تیرا نہ مرنے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

اُف وہ طوفاں وہ بھیانک ابر و باد
وہ ہوائے تند باراں وہ خروشِ برق و رعد

دفعتاً وہ روشنی کے سلسلے کا لوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا

وہ "اپالو" کے کلیجے پر مچلتی ماں سون
وہ سمندر کے تھپیڑے وہ ہواؤں کا جنون

اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا اِک بارگی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت، اور پھر موت تیری الاماں
ہڈیوں سے آنچ اُٹھتی اور بالوں سے دُھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تو اور میں اور بحر و باراں کا خروش
اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب... میں!

۳

بحر کے سینے کو جب طوفاں میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
تو زمیں بیٹھے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز باہم باہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دُھندلی سی دوپہر چھایاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کیلئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لیے

اگر جوش صاحب کا ستر ہواں عشق ہمیں اتنی خوبصورت نظم دے سکتا ہے تو اخلاقی اعتبار سے چاہے وہ کتنا ہی معیوب سہی لیکن ہمارے لیے گوارا ہے۔ اس لیے کہ یہ عشق شاعر کو تخلیق شعر پر اُکساتا ہے اور شاعری میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ گوئٹے، بائرن اور اسی طرح کے دوسرے شاعروں کی نجی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو جوش صاحب کی زندگی کے اس پہلو پر بھی پیار آنے لگتا ہے۔

میں نے ایک دن جوش صاحب سے اس خوبصورت نظم کا ذکر کیا، اور ٹٹولنے کے خیال سے پوچھا کہ واقعہ کیا تھا، تو صرف اتنا فرمایا کہ ایک خاتون خودکشی کے خیال سے سمندر میں کود پڑی تھیں، ہم نے انہیں بچایا۔ شکر ہے کہ ہم کامیاب ہوئے۔ خودکشی کی محرک ہماری ذات تھی۔"

اس سے زیادہ تفصیل انہوں نے نہیں بتائی۔ میرے لیے تو اتنی ہی تفصیل کافی تھی۔ کیونکہ میں ان دو جملوں کو سُن کر سب کچھ سمجھ گیا۔

جوش صاحب کا آخری ایک عشق بڑھاپے میں ہوا۔ اس میں عجیب عجیب واقعات پیش آئے اس کی تفصیل بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

جوش صاحب اس قسم کے واقعات کو عشق کہتے تھے۔ اس قسم کے سترہ اٹھارہ واقعات کو انہوں نے عشق سے تعبیر کیا۔ حالانکہ ان واقعات کا عشق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہوس رانی کی داستانیں ہیں۔ شاعر یہ سب کچھ کرنے پر آجائے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے ___ وہ تو شاعر ہے!

زندگی کے مختلف ادوار میں جوش صاحب کے اس عشق کے میدان مختلف رہے ہیں۔ کسی خاص عورت سے جذباتی قرب کو وہ عشق سمجھ لیتے ہیں۔ اگر یہی عشق ہے تو انسان ایک زندگی میں سینکڑوں عشق کر سکتا ہے۔ جوش صاحب کے تصورِ عشق میں اسی وجہ سے عظمت اور ترفع نہیں ہے۔ کیونکہ وہ میر کی سپردگی کو عشق نہیں سمجھتے۔ وہ تو غالب کی طرح پرستش کے بجائے خواہش کو عشق کا نام دیتے ہیں۔ اس لیے صحیح بات تو یہ ہے کہ جوش صاحب نے عشق وشق نہیں کیا ___ وہ تو صرف لذت کی شمع کے پروانے رہے لیکن ان کی یہ لذت جذباتی اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اسی کو وہ عشق کا نام دے دیتے تھے۔ عشق اس طرح نہیں ہوتا۔ جوش صاحب خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے عشق سے ان کا مطلب وہ عشق نہیں جس میں جانیں کھپائی جاتی ہیں بلکہ

محض جذباتی اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل مراد ہوتی ہے اور جذباتی اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے صنفِ لطیف سے اکتساب لذت کا یہ خیال جوش صاحب کے یہاں ایک فطری آہنگ کے ساتھ اُبھرتا ہے اور اُن کی ساری شخصیت پر چھا جاتا ہے۔ جوش صاحب صنف لطیف کو اسی لیے صانع ازل کی نازک اور لطیف ترین صنف سمجھتے ہیں۔ اس کا وجود انہیں شمع بزم عالم نظر آتا ہے۔ جس کی نازک ہستی کی تکمیل و تعمیر میں قدرت کی انتہائی تخیل دلربائی کام آتی ہے۔ اسی لیے تو وہ اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس دلچسپی لینے کو انسانی زندگی کی صحت مندی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صنف لطیف سے یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی ان کی شخصیت میں اس قدر نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ اسی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے زندگی کا ایک اہم پہلو۔

جوش صاحب کی شخصیت میں اس صنفِ لطیف کی ہمیشہ حکمرانی رہی ہے۔ اسی لیے تو بعضوں نے انہیں شاعر انقلاب" کی بجائے شاعر شباب کہا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ وہ شاعر شباب بھی ہیں۔ یہ خطاب انہیں زیب دیتا ہے۔ انہوں نے شباب کے گیت گائے ہیں۔ جوانی کے راگ سنائے ہیں۔ وہ جوانی جو پہلو میں آگ سی لگاتی ہے اور سینے میں ایک دھوم مچا دیتی ہے اور جس کے نتیجے میں حسن و عشق کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ دلوں کی بازی لگائی جاتی ہے۔ جوش صاحب خود ان منزلوں سے گزرے ہیں۔ ان کی جوانی خاصی دیوانی رہی ہے اور جوانی کا دیوانہ ہونا ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ وہ تو انسانی زندگی کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ جوش صاحب کی جوانی میں دیوانی ہو جانے والی کیفیت اسی لیے تو اپنے آپ کو اس قدر نمایاں کرتی ہے۔

اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جوش صاحب کی شخصیت میں صرف صنف لطیف ہی سے اکتساب لذت کا خیال نہیں ملتا، وہ مناظر فطرت سے بھی لطف اندوز ہوتے

تھے۔ انسانی زندگی کے عام رشتے اور حالات ان کے لیے لذت کا باعث بنتے تھے۔ ان کے نزدیک صبح کے منظر میں بھی ایک لذت تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں بھی ایک لذت تھی۔ چاندنی کی مسکراہٹ میں بھی ایک لذت تھی۔ رات کی تاریکی میں بھی ایک لذت تھی، ساون کی پھواروں میں بھی ایک لذت تھی۔ پروا ہوا کے چلنے میں بھی ایک لذت تھی۔ چاند کے طلوع ہونے اور آفتاب کے غروب ہونے میں بھی ایک لذت تھی۔ غرض زندگی میں ہر طرف وہ لذت ہی لذت محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں حسن دنیا کے چپے چپے پر بکھرا پڑا ہے۔ اور حسن کے بغیر لذت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جوش صاحب کے خیال میں اس حسن سے لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرنے کے لیے ایک نگاہ شباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کا ایک شعر ہے ؎

جس حُسنِ دلفریب پہ یُوں دُھن رہا ہے سر
تیری ہی بے خبر وہ نگاہ شباب ہے

اور یہ نگاہ شباب جوش صاحب کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ یہی ان کی شخصیت ہے۔ اس نگاہ شباب نے ساری انسانی زندگی اور کائنات کو ان کی نظروں میں حسین بنا دیا ہے اور حیات و کائنات کی ایک ایک چیز کو حسن سے معمور کر دیا ہے۔ ایسی چیزوں میں بھی وہ حسن کے پہلو نکال لیتے ہیں جو بظاہر حسین نہیں ہوتیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کوہستان دکن کی عورتوں میں وہ اُس حسن کو نہ دیکھ پاتے جو بظاہر تو بقول ان کے سنگ اسود کی چٹانیں ہوتی ہیں لیکن جن کا وجود کیا خبر کتنے دلوں کو پامال کرتا ہے۔

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا تیرا اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ بُرشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے سنگین شباب

کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
ان حسینوں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گاتی ہوئی راہوں، مسکراتی ہوئی پگڈنڈیوں اور کھیتوں کے درمیان ترشی ہوئی راہوں میں وہ حسن نہ دیکھ پاتے۔ گرمیوں کی دوپہر اور دیہات کے بازاروں میں انہیں حسن نظر نہ آتا لیکن انہوں نے اس نوعیت کے ان گنت مناظر میں حسن کو دیکھا ہے، اس سے متاثر ہوئے ہیں اور ان سب کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

جوش صاحب یوں جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو عام انسانوں سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خیر ہی خیر تھے۔ شر کا شائبہ تک ان کی شخصیت میں نہیں تھا۔ دشمن کے ساتھ بھی وہ نیکی کرتے تھے۔ مفسد کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے تھے۔ مخالف کے ساتھ بھی ہمدردی کرتے تھے۔ اسی لیے عفو و درگزر کا یہ پہلوان کی زندگی میں بہت نمایاں ہے۔ کوئی انہیں بڑی سے بڑی تکلیف بھی پہنچائے تو وہ اسے معاف کر دیتے تھے۔ انتقام کا تو کبھی خیال بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی انسان کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لیے دوسروں کا دکھ ان کے ہاں ان کا اپنا دکھ بن جاتا تھا اور دوسروں کی تکلیف کو وہ اپنی تکلیف بنا لیتے تھے۔

یہی کیفیت ان کے تصور انقلاب کا منبع ہے۔ وہ انقلابی تھے۔ اُنھوں نے انقلابی شاعری کی، اور صرف اس لیے کی کہ اس کے بغیر انھوں نے انسانوں کو تکلیف میں دیکھا، پریشانی میں گرفتار پایا، انسان پر انسان کی بیداد ان کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ جبر و استبداد کا عفریت انھیں انسانی زندگی پر ناچتا ہوا نظر آیا، اور اس کی یہ کیفیت انھیں مرغِ بسمل کی طرح تڑپاتی رہی۔ اس لیے وہ اس نظام پر جھنجلا اٹھتے تھے جس میں انسانوں کے لیے زندگی کی آسائشیں نہیں ہیں۔ راحت

اور آرام نہیں ہے۔ جن کی زندگی محض آلام سے عبارت ہے۔ شاعر انقلاب اس نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ اس عالم میں وہ خوں ریزی کے خیال سے بھی وہ گریز نہیں کرتے۔ تصور میں خون کی ندیاں بہانے تھے اور ان کا نعرہ انقلاب و انقلاب ہو جاتا تھا۔ اس انقلاب میں ان کی نظر زوال جہانبانی کو دیکھتی تھیں اور ایک ایسا نیا نظام اقدار انہیں بہر صورت قائم ہوتا ہوا نظر آتا تھا جس میں امن اور عافیت کا ہونا یقینی ہے، اور جس میں امیر و غریب، آقا اور مزدور کی تفریق کا مٹ جانا لازمی ہے۔ بس یہی جوش صاحب کا تصورِ انقلاب تھا۔ ان کے انقلاب میں جھنجلاہٹ زیادہ ہے۔ ایک اُبال کی سی کیفیت زیادہ نمایاں ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے انقلاب کو ایک ہنگامہ بنا دیا ہے۔ عمرانیات کے مفکروں نے انقلاب کے جو تصورات پیش کیے ہیں، ان سے شاعر انقلاب کو غرض نہیں۔ وہ تو انقلاب چاہتے ہیں۔ لیکن اس انقلاب میں کسی منصوبہ بندی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیعت کا اضطراب انہیں اتنی مہلت ہی کہاں دیتا ہے؟ مزاج کی بے چینی اتنی فرصت ہی کب دیتی تھی۔ وہ انقلاب کے معاملات پر غور نہیں کرتے اس پر عمل زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ جوش صاحب کے یہاں انقلاب کا تصور اگرچہ تمام رومانی اور تخیلی ہے لیکن اس کے باوجود وہ تمام تر انسانی محبت اور ہمدردی سے لبریز ہے۔

شاعر انقلاب کو سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اگر کبھی کسی سیاسی بات کا خیال انہیں آتا بھی تھا تو صرف عام انسانوں کی بہتری کے خیال سے آتا تھا۔ اگر کبھی وہ سیاسی معاملے کی طرف متوجہ ہوئے بھی تھے تو ان کے پیش نظر نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہوتی تھی۔ جو سیاست عوام سے دور ہو اس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ گزشتہ نصف صدی کی ملکی سیاست میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کی اور اس طرح قومی تحریکوں میں شریک ہوئے۔ انگریز

نے ان کے ہم وطنوں پر کئی سو سال تک ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، اور اس طرح انہیں آزادی اور فارغ البالی کی مسرتوں سے محروم رکھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ انگریز کے مخالف رہے۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی ہے تو یہ مخالفت بہت واضح ہو کر سامنے آئی۔ اپنی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ وطن پرستی اور عوام دوستی کے زیر اثر کہا ہے۔ پھر جب حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں تو انہوں نے ملک میں اشتراکی سیاست کی ہم نوائی بھی صرف اسی خیال سے کی ہے کہ شاید یہ عوام کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ بہر حال ان کی سیاست عام انسانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد افراتفری اور انتشار کا دور دورہ ہوا، اور اس کے نتیجے میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں :-

"کہہ نہیں سکتا عبادت صاحب! کہ اس تقسیم اعضاء و جوارح کا میرے دل پر کس قدر اثر ہے۔ حیات کے تمام ولولے ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کیا بٹا کہ سب کچھ لٹ گیا۔ مجھ پر لعنتوں کی بارش اور پھٹکاروں کی بوچھار!

جینے سے میں سیر ہو چکا ہوں۔ جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر تھک کر چور ہو چکا ہوں کہ اب زندگی کا چلانا جیسے ترین قید با مشقت معلوم ہو رہا ہے۔

اپنے کو فریب عیش دیتے دیتے ۔۔۔ سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے ۔۔۔ اف جہد حیات تھک چکا ہوں معبود!

نیاز مند جوش

یہ سطریں شاعر انقلاب سے اسی انسانی احساس نے لکھوائی ہیں جسے وہ کسی حال میں بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتے۔ اسی انسانی احساس نے انہیں سیاست کو جذبات کی عینک سے دیکھنا سکھایا۔ سیاست انسانی جذبات پر برا اثر کرے تو وہ اس

کو ایک لعنت اور پھٹکار سمجھتے تھے۔ موجودہ دور کی سیاست اسی انسانی احساس سے محروم ہے۔ اسی لیے میں نے جوش صاحب کو کبھی بھی سیاست کی باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا۔ البتہ سیاست جس طرح انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے بارے میں وہ اکثر گفتگو کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا۔ جیسے انہیں سیاست کے غیر انسانی ہونے کا بڑا دکھ ہے اور وہ ایک کرب کے عالم میں اس پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ یہ کرب کا سا عالم میں نے اکثر ان پر طاری دیکھا ہے۔

جوش صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ سیاست میں جو جھوٹ بولا جاتا ہے اور منافقت اور مصلحت اندیشی سے جو کام لیا جاتا ہے اُس کے ساتھ وہ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ سچے صاف گو اور کھرے آدمی ہیں۔

جوش صاحب، اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک سپاہی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس دور کی سیاست میں کبھی کوئی عملی حصّہ نہیں لیا لیکن اپنی شاعری کے ذریعے سے انہوں نے اس جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی پر نظمیں لکھیں، جدوجہد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انقلاب کے خواب دیکھے، غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے للکارا۔ اور اس طرح نوجوانوں کے خون میں گرمی پیدا کی۔ جس کے نتیجے میں انگریزوں کی حکومت کی بنیادیں ہل گئیں اور اُن کے قدم ڈگمگا گئے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جوش صاحب کا ایک نمایاں حصّہ ہے۔ انہوں نے اپنی انقلابی نظموں سے اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، اُن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

لیکن آزادی جس طرح آئی۔ اُس نے جوش صاحب کو ہلا کر رکھ دیا۔ خاص طور پر صوبوں کی جو تقسیم ہوئی، اور اس سلسلے میں انگریزوں اور ہندوؤں نے جو سازشیں کیں، اور جس کے نتیجے میں خون کے دریا بہائے گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ لاکھوں انسان موت کے

گھاٹ اتارے گئے۔ کروڑوں اِدھر سے اُدھر، ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ عورتوں کی جو آبروریزی ہوئی، اور انسان جس طرح درندہ بن گیا، اس کو جوش صاحب نے شدّت سے محسوس کیا، اور وہ زندگی سے بیزار ہو گئے۔ انہوں نے ماتم آزادی کی تخلیق کی جس میں فسادات، بہیمیت اور سفاکی کو پوری طرح بے نقاب کیا۔

چند سال وہ اس صورتِ حال کو دِلّی میں بیٹھ کر برداشت کرتے رہے لیکن برادرانِ وطن کی عصبیت جس طرح تہذیبی اور لسانی قدروں کا خون کیا، اور ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور اُن کے آثار کو مٹانے کی کوشش کی، اُس کو وہ برداشت نہ کر سکے، اور بالآخر آزادی کے بعد صرف چند سال گزارنے کے بعد وہ پاکستان میں اقامت اختیار کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حالانکہ ہندوستان میں اُن کے پاس سب کچھ تھا۔ کروڑوں روپے کی آبائی جائیداد تھی، ملازمت تھی۔ پدم بھوشن کا اعزاز تھا —— اور ہندوستان کے وزیرِاعظم جواہر لال نہرو تھے، جن سے بے تکلفی کی حد تک اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن انہوں نے ان سب کو خیرباد کہہ دیا اور وہ سکندر مرزا صاحب کے زمانے میں کراچی آ کر آباد ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے اُن کی پذیرائی ہوئی عوام نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ادیبوں اور دانش وروں نے ان کی آؤ بھگت کی —— اور اس طرح اس عہد کے ایک عظیم شاعر کے پاکستان آنے سے ہندوستان کی حکمت عملی کو دھچکا لگا اور پاکستان کا وقار بڑھا۔

میں نے قیام پاکستان کے وقت دلّی سے چلتے ہوئے جوش صاحب کی ذہنی کیفیت کو محسوس کر کے یہ پیش گوئی کی تھی کہ آپ دو چار سال سے زیادہ دِلّی میں نہیں رہ سکیں گے، اور بالآخر آپ کو کراچی آنا پڑے گا۔

اُس وقت جوش صاحب نے صرف یہ فقرے کہے تھے۔ "دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ دل تو یہاں نہیں لگتا۔ احباب سب وہاں ہیں، یہاں تو ہر طرف لکڑ بھگے نظر آتے ہیں"۔

چنانچہ میری یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

جوش صاحب کھرے آدمی تھے اس لیے دلّی میں رہ کر بھی جو بات اُن کے دل میں آتی تھی، اس کا برملا اظہار کرتے تھے جگہ جگہ پاکستان کی تعریف کرتے تھے، اور اس کے معاشرے کو ترقی پسند بتاتے تھے۔

مزے کی بات یہ ہوئی کہ ہندوستان کی حکومت نے غالباً ۴۸ءمیں اُنہیں مقبوضہ کشمیر بھیجا تاکہ وہ اپنی طویل نظم "حرف آخر" مکمل کرلیں۔ جوش صاحب چلے تو گئے مقبوضہ کشمیر کے وزیراعظم شیخ عبداللہ کے ہاں مہمان رہے۔ اُن پر ایک نظم بھی لکھی جس میں کہا کہ میں نے بہت سے شیخ دیکھے ہیں لیکن ایسا شیخ نہیں دیکھا جیسے کہ شیخ عبداللہ ہیں — اور چند مہینے کے بعد واپس آکر دلّی کی محفلوں میں کشمیر کے بارے میں جو باتیں کیں اُن کی وجہ سے وزیراعظم ہند جواہر لال نہرو تک پریشان ہوئے۔

وہ باتیں یہ تھیں کہ صاحب! کشمیر کے دوران قیام میں میں نے وزیروں سے پوچھا، دفتری لوگوں سے دریافت کیا، بوٹ والوں سے باتیں کیں، راہگیروں سے تبادلہ خیال کیا، سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ووٹ ہم پاکستان کو دیں گے اور ہمارا تعلق ہمیشہ ہمیشہ پاکستان ہی سے رہے گا۔"

جوش صاحب کی اِن باتوں نے ہندوستان کے ارباب اختیار کو پریشان کر دیا، اور جواہر لال کو ذاتی طور پر اُن سے یہ کہنا پڑا کہ جوش صاحب، ہم پر رحم کیجئے"۔

لیکن جوش صاحب بھلا کب کسی کی سُنتے تھے۔ جو کچھ اُن کے دل میں آئے اس کے کہنے سے کوئی انہیں باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اِن باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اور بالآخر جوش صاحب کو پاکستان آنا پڑا۔

پہلے وہ عارضی طور پر آئے، اور چند مہینے کراچی اور پھر لاہور میں قیام کیا۔
چند مہینے کے قیام کے بعد جب وہ واپس دلّی جانے لگے تو لاہور اسٹیشن پر میں

انہیں رخصت کرنے کے لیے گیا تھا۔ جب وہ گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی چلنے کے لیے تیار ہوئی تو مجھ سے معانقہ کیا" اور کہنے لگے

"اچھا عبادت صاحب! اب رخصت ہوتے ہیں۔ ابھی چند منٹ کے بعد لکڑ بگھے ہی لکڑ بگھے نظر آئیں گے" اب وہاں جی نہیں لگتا"۔

میں نے کہا "خیر اب تو آپ مستقل طور پر یہاں آ ہی رہے ہیں"۔

کہنے لگے "جی ہاں! انشاء اللہ جلد آئیں گے"۔

دراصل حکومت پاکستان سے اُن کے تمام معاملات طے ہو گئے تھے، اور اب وہ اپنا سامان لینے کے لیے دلّی جا رہے تھے۔

چند مہینے بعد وہ مع سامان، اور بیوی بچوں کے پاکستان واپس آ گئے۔ کراچی میں عالیشان مکان تعمیر کرایا۔ ترقی اُردو بورڈ میں انہیں ملازمت مل گئی، اور وہ کسی قدر اطمینان سے رہنے لگے۔ چند سال اسی طرح گذرے لیکن کراچی کی آب و ہوا، انہیں راس نہیں آئی۔ اس لیے حکومت کے ایما پر انہوں نے اسلام آباد منتقل ہونا مناسب خیال کیا۔

چنانچہ آخر دم تک وہ مستقل طور پر اسلام آباد ہی میں رہے۔ حکومت نے انہیں رہنے کے لیے مکان دیا۔ تنخواہ مقرر کی اور اُن کا ہر طرح خیال رکھا۔ اب ان کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے کے کاموں میں گذرنے لگا۔

میں اکثر اسلام آباد جاتا اور اُن کی خدمت میں ایمبسی روڈ والے مکان میں حاضری دیتا تھا۔ جوش صاحب کو یوں تو میں نے خوش اور مطمئن دیکھا۔ البتہ بچوں کی وجہ سے وہ کچھ پریشان سے رہتے تھے۔ اور اکثر شکوہ کرتے تھے۔

موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد میں ایک دفعہ جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے حالات دریافت کیے۔

جوش صاحب نے بتایا کہ "مکان بھی ان کے پاس ہے۔ تنخواہ بھی مہینے کے مہینے ملتی ہے۔ صدر صاحب کا پیغام بھی آیا تھا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں۔ اور جلد ملیں گے۔ لیکن شاید مصروفیت کی وجہ سے وقت نہ نکال سکے"۔

مجھے اُن کی یہ باتیں سُن کر اطمینان ہوا۔

انتقال سے کوئی سال بھر قبل میں ایک دفعہ پھر اُن کی مزاج پُرسی کے لیے حاضر ہوا۔ اطلاع کروائی۔ فوراً اپنی اسٹڈی میں تشریف لے آئے۔ چائے منگوائی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ "آج کل میرا زیادہ وقت لغات کے مطالعے میں گذرتا ہے۔ اب زیادہ کام نہیں ہوتا۔ تھک جاتا ہوں"۔

اس دفعہ میں نے یہ محسوس کیا کہ جوش صاحب کی صحت جواب دے چکی ہے۔ اُن کی وہ شگفتگی جو کبھی گل و گلزار کھلاتی اور محفلوں کو زعفراں زار بناتی تھی ختم ہو چکی ہے۔ اور اب وہ ایک بجھ جانے والی شمع ہو کر رہ گئے ہیں۔

چنانچہ اداسی کے عالم اُن سے رخصت ہو کر لاہور واپس آیا۔

اور چند مہینے بعد ہی یہ خبرِ وحشت اثر سُنی کہ جوش صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ شمع بجھ گئی جس نے شعر و ادب کی دنیا کو تقریباً ایک صدی تک اُجالے سے ہم کنار رکھا تھا۔

جوش صاحب بظاہر دیکھنے میں مذہبی آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن مذہب کے اثرات ان کے خون میں رچے ہوئے تھے۔ اُن کا بچپن مذہبی ماحول میں گذرا تھا۔ دینی علوم اور اسلامی تاریخ کی انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ جوانی میں، ان پر تصوف کا بھی اثر ہو گیا تھا اور تقریباً انہوں نے فقیری لے لی تھی۔ گیروے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ داڑھی بڑھالی تھی۔ سر پر کاکلیں رکھ لی تھی۔ اسلامی تصوف کے علم برداروں اور ٹیگور کے اثر سے ویدانت کے پرستاروں کے اثرات جوش صاحب کے اس رویے میں خاصے نمایاں

تھے۔ تصوف سے دلچسپی کا یہ دور تو جوش صاحب کے ہاں کچھ زیادہ دیر نہیں رہا۔ البتہ مذہبی معاملات سے اُن کی دلچسپی کبھی بھی کم نہیں ہوئی۔ میں نے اکثر انہیں دوران گفتگو کلام پاک اور حدیثوں کے حوالے دیتے ہوئے سُنا ہے۔ اسلامی تاریخ کی اہم شخصیتوں کا ذکر تو وہ اکثر کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے تو وہ شیدائیوں میں تھے۔ ان کی نظمیں "شمع ہدایت" اور "پیغمبر اسلام" اس کا واضح ثبوت ہیں۔ جوش صاحب کی ایک نہایت ہی مختصر نظم اذان ہے۔ صرف تین شعر ہیں لیکن اس میں کس بلا کا سوز اور کس درجے کا والہانہ جذب و شوق ہے۔ کیا خوب کہا ہے ا؎

اُفق سے سحر مُسکرانے لگی　　　مؤذن کی آواز آنے لگی

یہ آواز ہر چند فرسودہ ہے　　　جہاں سوز صدیوں سے آلودہ ہے

مگر اس کی ہر سانس میں مُتصل

دھڑکتا ہے اب تک محمدؐ کا دل

پھر حضرت امام حُسینؑ پر انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں، سُورۂ رحمن کا جو ترجمہ کیا ہے۔ اور اسلامیان ہند کی حالت زار کا جہاں جہاں تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں اُمت مسلمہ کا کتنا درد تھا، اور وہ اپنے عقائد میں کتنے سخت تھے۔ پھر جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جوش صاحب کا کوئی فقرہ ماشاءاللہ، سبحان اللہ اور انشاءاللہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ بات بات میں وہ خدا، رسولؐ، آل رسولؐ اور صحابۂ کرام کے حوالے دیتے تھے۔

اسی لیے میں یہ بات کہتا ہوں کہ جوش صاحب کے خون میں مذہبی رنگ و آہنگ سرایت کیے ہوئے تھا۔ اور وہ خود کہا کرتے تھے کہ "اسلام تو میری رگ رگ میں پیوست ہے۔ وہ تو میرے خون میں رواں دواں ہے۔ میں اس سے کس طرح اپنے آپ کو الگ رکھ سکتا ہوں"۔

اور واقعی وہ کبھی بھی اس مخصوص رنگ و آہنگ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ اُن کی روشن خیالی عقل پسندی اور فلسفۂ تشکیک سے وابستگی کے باوجود اس کی چھاپ اُن کے ہاں گہری رہی۔

دراصل جوش صاحب اسلامیان ہند کے اُس فکری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے فکر کی بنیاد عقلیت پر اُستوار تھی، جو اجتہاد کے قائل تھے، اور دینی معاملات کو نئے زاویۂ نظر سے دیکھتے تھے، اور جن کو پیچھے کی طرف لوٹنا نہیں آتا تھا۔ ان میں غالبؔ مومن، سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی عبدالحق، علامہ اقبالؒ اور جوش ملیح آبادی سب ہی شامل ہیں۔

لوگوں نے خواہ مخواہ جوش صاحب کے مذہبی عقائد کے بارے میں بات کا بتنگڑ بنایا ہے۔ اور انہیں بلاوجہ بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرے خیال میں تو جوش صاحب دل سے ایک روشن خیال اور عقلیت پسند مذہبی آدمی تھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ان کے اندر حد درجہ جذب و کشش نے ایک طرح کی روحانیت کو پیدا کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں اُن کی زندگی کے دو واقعات مجھے کبھی نہیں بھولتے۔ جوش صاحب نے خود مجھے یہ واقعات کئی بار سُنائے ہیں۔ یہ دونوں واقعات اس زمانے کے ہیں جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔

اور آج میں بالکل اسی طرح اِن واقعات کو بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ جس طرح جوش صاحب نے بیان کیے تھے۔

جوش صاحب کہتے تھے کہ "جب ہم مع اہل و عیال کے پاکستان آ گئے تو سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی میں ایک مکان میں قیام کیا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر ریلوے لائن تھی، اور دور تک خاصا بڑا میدان تھا۔

میں حسب معمولی صبح کو تین بجے۔ بیدار ہوتا تھا، اور معمولات سے فارغ ہو کر منہ اندھیرے کوئی چار ساڑھے چار بجے کے قریب، پان کھا کر ٹہلنے کے لیے نکلتا تھا، اور کوئی ایک گھنٹہ تازہ ہوا کھا کر واپس آتا تھا۔

مجھے پاکستان کے موٹے موٹے پان اچھے نہیں لگتے تھے، اور اُن کو کھا کر طبیعت بدمزہ ہوتی تھی کیونکہ عادت تو ہندوستان کے لطیف اور نفیس پانوں کی پڑی ہوئی تھی۔

ایک دن جب میں منہ اندھیرے پان کھا کر نکلا تو چلتے وقت بیگم سے کہا کہ یہ موٹے موٹے سخت پان مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان سے تو منہ چھل گیا ہے۔

بیگم نے کہا، "پاکستان میں تو اسی طرح کے پان ملیں گے۔ اُن کو تو کھانے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔ روز روز ہندوستان سے تو دیسی دساوری اور بنگلہ پان آنے سے رہے۔

یہ سب کچھ سُن کر جب میں باہر نکلا اور ریلوے لائن کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک شخص دوڑتا ہوا میری طرف آرہا ہے۔ تنگ پاجامے اور کُرتے میں ملبوس، سر پر مخمل کی سیاہ رنگ کی ٹوپی، اور زبان پر یہ الفاظ 'اے قلندر! اے قلندر!' ——— بس ان الفاظ کے علاوہ اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا، اور منہ پھیر کر ایک ٹُپلیا میرے ہاتھ میں تھما دی، اور فوراً اے قلندر، اے قلندر کہتا ہوا اور تیزی سے دوڑتا ہوا واپس چلا گیا، ——— میں نے جو اس ٹُپلیا کو کھول کر دیکھا تو اس میں نہایت عمدہ قسم کے لکھنوی پان تھے۔

میں فوراً واپس گھر آیا، اور یہ واقعہ سُنا کر پان بیگم کو دیئے۔ بیگم خوش ہوئیں، اور یہ کہا کہ یہ اللہ کی دین ہے۔ غیب سے یہ نعمت آپ کو ملی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے"۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ سب کیا تھا، اور کیسے ہوا؟

دوسرا اسی طرح کا واقعہ انھوں نے یہ سُنایا کہ ہم لوگ تو پہلے کراچی آگئے تھے۔ سامان دلی سے ریل کے ذریعے بُک ہوا تھا، اور لاہور ہوتا ہوا بعد میں کراچی پہنچا۔ ریلوے والوں نے اطلاع دی کہ بارہ سو تراسی روپے ادا کر کے اپنا سامان لے

جاہیئے۔" میرے پاس اس وقت اتنی رقم نہیں تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ اس لیے پریشان رہا۔

صبح کو جب میں معمول کے مطابق ٹہل کر واپس آ رہا تھا تو وہی شخص جو پہلے پان دے گیا تھا، ریلوے لائن کی طرف سے دوڑتا ہوا آیا، اور اے قلندر، اے قلندر، کہتے ہوئے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا، اور تیزی سے قلندر قلندر کا نعرہ لگاتا ہوا واپس چلا گیا۔

میں اندر گیا۔ بیگم کو وہ لفافہ دیا۔ انہوں نے کھولا تو اس میں پورے بارہ سو تراسی روپے تھے۔ ہم لوگ حیران ہوئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال میں نے اس رقم سے اپنا سامان چھڑا لیا۔

لیکن آج تک یہ راز نہ کھلا کہ وہ شخص کون تھا، اور اس رقم کا اسے کیسے علم ہوا؟ اور وہ کیوں مجھے یہ رقم دے گیا؟"——

ان واقعات کو سن کر میں نے جوش صاحب سے کہا کہ "آپ ان واقعات کا تجزیہ عقل سے کام لے کر کس طرح کریں گے"؟

کہنے لگے "سمجھ سے باہر ہے۔ شاید ہمارے اندر جو جذب وکشش ہے اس کی وجہ سے یہ واقعات ظہور پذیر ہوئے"——

میں یہ سن کر حیرانی کے عالم میں خدا جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔

اب اس کو ان کی روحانیت نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے!

ایک دن میں نے جوش صاحب کے سامنے اُن کا یہ شعر پڑھا ؎

عرفان کا ذوق لے لے اے زندگی خدارا

دریائے معرفت کا ملتا نہیں کنارا

اور کہا کہ "آپ تو مذہب اور روحانیت کے قائل ہیں نہیں۔ پھر یہ تصوف کا شعر

آپ نے کیسے کہہ دیا؟

کہنے لگے "عبادت صاحب! یہ تصوف کا شعر نہیں ہے۔ آپ نے اسے تصوف کا شعر کیسے سمجھ لیا"؟

میں نے کہا "اس میں تو کھلم کھلا عرفان اور معرفت کا ذکر ہے اور عرفان و معرفت کا مطلب ہماری ادبی روایت میں معرفت الٰہی ہے"۔

انہوں نے جواب دیا "شاید آپ کو عرفان کے لفظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ عرفان سے مُراد عرفان حیات ہے"۔

میں نے کہا۔ "آپ نے خوب بات بنائی ہے"!

کہنے لگے "بات نہیں بنائی حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں عرفان حیات کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ابھی تو انسان نے گھٹنوں چلنا سیکھا ہے۔ ابھی تو انسان نے عرفان حیات کی اولین منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں۔ ابھی تو اس راہ پر اسے نہ جانے کتنا آگے جانا ہے۔ سائنس اور فلسفے کے نہ جانے کتنے انکشافات ابھی کلی سے پھول بننے کی راہ دیکھ رہے ہیں"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مابعد الطبیعیاتی باتوں کے ساتھ ساتھ حیات انسانی کی ایسی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ جن کی نوعیت ذہنی اور فکری تھی۔ عرش سے زیادہ فرش ان کے پیش نظر رہتا تھا۔

وہ مذہبی معاملات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن مذہبی معاملات سے انہیں دلچسپی ضرور تھی۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مذہب کے مختلف پہلوؤں پر بڑی گہرائی سے گفتگو کرتے تھے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے تھے۔ اور ان کی باتوں میں خاصی اُپج اور خاصا نیا پن ہوتا تھا اور وہ خاصی خیال انگیز اور دلچسپ ہوتی تھیں۔

جوش صاحب اسلام کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی پسند مذہب سمجھتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے "میں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا ہے لیکن میں جس مذہب کی اہمیت کا قائل ہوں وہ اسلام ہے۔ زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ ترقی پسندانہ زاویۂ نظر کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔"

اس پر میں نے کہا "ترقی پسند زاویۂ نظر سے آپ کا کیا مطلب ہے"؟

انہوں نے جواب دیا "اس میں انسانیت کا خیال سب سے زیادہ ہے"۔ کہنے لگے، اسلام میں اس خیال کی بنیاد روشن خیالی پر استوار ہے اور یہی اس کا ترقی پسندانہ پہلو ہے۔

جوش صاحب ہر وقت حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کا ذکر کرتے تھے اور اس ذکر میں ان بزرگوں کے ساتھ خاصی عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ بچپن میں اپنی دادی کے اثر سے ان پر شیعہ عقائد کا رنگ چڑھ گیا تھا اور وہ مختلف زاویوں سے اکثر اپنی جھلک دکھاتا تھا۔

جوش صاحب نے خود اس سلسلے میں ایک دفعہ بڑی مزے دار بات کہی تھی کہ "بھئی میرے یہ عقائد تو اب ایک   کی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ جانتے ہیں یہ مرض ایسا [illegible] ہے کہ کبھی جاتا نہیں"۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جوش صاحب انسانیت اور انسان دوستی کو مذہب سمجھتے تھے۔ انسانی اقدار کی پامالی پر ان کا دل تڑپ جاتا تھا۔ وہ اس کی نفی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جوش صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ وہ فلسفی نہیں تھے لیکن ان کے یہاں ایک فلسفیانہ رجحان ملتا ضرور ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کیا اور اس غور و فکر کے بعد چند نتائج نکالے انہوں نے مابعد الطبیعاتی معاملات

کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ زندگی میں مادہ ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس مادی زندگی میں خیر و شر کے درمیان ایک آویزش اور کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی کشمکش اور آویزش کے درمیان انسانی زندگی آگے بڑھتی ہے اور ارتقا کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے۔ یہی خیر و شر کی آویزش ہے۔ یہی جدلیات کا نظریہ ہے۔ تہذیبی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی غرض تمام مسائل کو وہ اسی فلسفیانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن آخر میں ان کے یہاں بہر حال شاعر فلسفی پر غالب آجاتا تھا اور وہ فلسفی کے بجائے صرف شاعر رہ جاتے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ جدلیات پر ایمان رکھنے کے باوجود جبر کے اتنی شدت سے قائل نہ ہوتے۔ انسانی زندگی انہیں محرومی، کس مپرسی اور بے بسی کا شکار نظر نہ آتی۔ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ جذبات کا پہلوان کی شخصیت میں اس قدر غالب تھا کہ وہ اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ وہ جبر کے اس حد تک قائل تھے کہ بعض اوقات تو ان کی باتیں سن کر شوپنہار اور ہارڈی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

ایک شام جوش صاحب شراب پی رہے تھے کہ بات جبر و اختیار کے فلسفیانہ مسائل پر چھڑ گئی۔

میں نے کہا "آپ یہ شراب اپنے اختیار ہی سے تو پی رہے ہیں"۔

کہنے لگے "مجھے اس پر بالکل اختیار نہیں"۔

میں نے کہا۔ "یہ کس طرح ؟"

کہنے لگے "کوئی طاقت مجھ سے کہتی ہے کہ اس گلاس میں شراب انڈیل دو میں انڈیل دیتا ہوں۔ پھر کوئی طاقت کہتی ہے ہاتھ بڑھاؤ میں ہاتھ بڑھا دیتا ہوں۔ پھر وہ طاقت کہتی ہے۔ شراب پیو کہ اس سے تمہیں زندگی کی لذت حاصل ہوگی۔ سُرور ملے گا۔ جہاں کا غم غلط ہو جائے گا۔ بس میں شراب پی لیتا ہوں۔ اس میں میری ذات کو

تو ذرا بھی دخل نہیں"۔

میں نے کہا "جوش صاحب! بڑی شاعرانہ بات ہے جو آپ نے کہی ہے لیکن اس خاکسار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جو شراب نہیں پیتا۔ اور اس معاملے میں اتنا سخت ہے کہ کوئی طاقت اُسے اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔

اس پر انہوں نے جواب دیا۔ "عبادت صاحب! آپ کی قسمت میں تو محرومی ہی لکھی ہے۔ بس یہی ایک حقیقت ہے۔ انسان بے بس ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں"۔

اور پھر انہوں نے انسانی زندگی کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں شروع کر دیں کہ قدم قدم پر اس زندگی میں انسان کو بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچپن جوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جوانی بڑھاپے میں بدل جاتی ہے۔ اور موت کا خطرہ ہر ہر گام پر درپیش ہوتا ہے۔ چنانچہ موت آتی ہے۔ پھول سے شگفتہ چہرے کملا جاتے ہیں۔ کیسی کیسی صورتیں خاک میں پنہاں ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کا کچھ بھی بس نہیں چلتا۔ مشیت کا یہ منشا ہے کہ ہر شخص کی خواہش اس کے دل میں ایک داغ بن جائے۔ میں نے چند اشعار میں اس خیال کو واضح کیا ہے۔ سنیئے عبادت صاحب! غور سے سنیئے

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا — کہ قلب آدم خاکی سدا فگار رہے

بس ایک بار میسر ہوں حسن کی باہیں — تمام عمر کو حسرت گلے کا ہار رہے

ہر ایک بوسۂ شیریں کا مدعا یہ ہے — کہ داغ بن کے کلیجے میں یادگار رہے

صاحب! یہی انسانی زندگی ہے۔ انسان کو ساری زندگی ہائے ہائے کرتے گزرتی ہے۔ اور پھر جب مرنے کے قریب پہنچتا ہے تو اس کا منہ بٹوا ہو جاتا ہے بٹوا۔ اور پھر یہیں پر بس نہیں، مرنے کے بعد بھی کہاں چین ملتا ہے۔ سرِ حشر بھی حساب لیا جائے گا۔ ایک رباعی یاد آگئی سنیئے ؎

معبودا! حیات تھی سو مرتے گزری ہر آن کے دغدغوں سے ڈرتے گزری
اس عمر کا بھی حساب لے گا سرِ حشر جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

مشیت کی یہ خواہش ہے کہ جو شخص بھی مرے اس کا منہ بٹوا ہو جائے پچک جائے۔ سوکھ جائے دیکھنے کے قابل نہ رہے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر کہنے لگے۔

"آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے عبادت صاحب! کہ اس دُنیا میں انسان کو کتنی مختصر سی زندگی ملتی ہے، اس مختصر سی زندگی میں وہ کیا کیا کچھ کرتا ہے۔ زمین سے سونا اُگلواتا ہے۔ سمندروں کے سینوں پر دوڑتا ہے۔ آسمانوں پر پرواز کرتا ہے اور کائنات کو تسخیر کر لیتا ہے۔ ساری انسانی زندگی انسان کی عظمت کا ایک نغمہ ہے، راگ ہے، ایک الاپ ہے۔ لیکن مشیت اس کا صلہ انسان کو یہ دیتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے قوئی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کام کرنے کے قابل ہوتا ہے یعنی جب ذہنی طور پر بلوغت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ تو اسے کام کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ قدغن لگا دی جاتی ہے کہ اب کام نہیں کر سکتے۔ اب تم بیکار ہو۔ اب تمہارے تجربے کی زندگی کو ضرورت نہیں ہے۔ انسان جب ذہنی فکری اور عملی اعتبار سے بلوغت کو پہنچتا ہے تو اسے اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس کو موت آجاتی ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ یہ کون سا قانون ہے؟ خدارا مجھے بتائیے عبادت صاحب!"

اور میں نے ہمیشہ ان کی ایسی باتوں کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہی سے دیا ہے۔

شاعرِ انقلاب نے مختلف ملاقاتوں میں مجھ سے اس طرح کی بے شمار باتیں کی ہیں۔ اتفاق اور اختلاف سے قطع نظر ان باتوں کو جوش صاحب کی زبانی سن کر مجھے ایسا لطف آتا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ان تمام باتوں کی بنیاد شدید انسانی احساس تھا۔ انہیں انسانی زندگی سے جو گہرا لگاؤ اور تعلق تھا، وہ ان سے اس قسم

کی باتیں کہلواتا تھا۔ وہ انسانی زندگی اور اس کی مسرتوں کے شیدائی تھے، اور انہیں مسرتوں کو حاصل زندگی سمجھتے تھے۔ اس لیے جب یہ مسرتیں انہیں آندھیوں کی زد پر نظر آتی تھیں تو اس قسم کے خیالات کا اظہار ان کے لیے ناگزیر ہو جاتا تھا۔ پیمانہ لبریز ہو جائے تو شراب چھلک ہی پڑتی ہے۔

لیکن زندگی کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے اور اس کے متعلق اس انداز میں سوچنے کے باوجود وہ ارتقا پر ایمان رکھتے تھے۔ حیات انسانی نے ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں اس کا ذکر انہوں نے ہمیشہ بڑے فخر سے کیا۔ اسی ارتقا میں انہیں انسانی زندگی کی عظمت نظر آتی تھی۔ نئے سے نئے فلسفیانہ نظریات، نئے سے نئے عمرانی تصورات، نئے سے نئے سائنسی انکشافات پر وہ بڑی ہی پر لطف باتیں کرتے تھے۔ اور اُن کی اس قسم کی باتوں سے زندگی کو بسر کرنے اور اس کو برتنے کا ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ اور اس طرح اس کی صحیح اہمیت ذہن نشین ہوتی تھی۔

ایک دن میں نے دورانِ گفتگو بات میں بات پیدا کرنے کی غرض سے جوش صاحب سے کہا۔ "آپ ارتقاء کے قائل ہیں لیکن انسان کو مجبور و معذور سمجھتے ہیں۔ کیا اس میں تضاد نہیں ہے"؟

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا "یہ تضاد تو خود زندگی میں موجود ہے"۔

میں نے کہا "اس ارتقا کے باوجود آج انسان موت کے سامنے بے بس ہے۔ کیا آپ کے خیال میں کوئی زمانہ ایسا آسکتا ہے کہ وہ موت پر حاوی ہو جائے اور اس پر قابو پالے"۔

کہنے لگے "انسان کی ترقی کی رفتار سے یہ بعید نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہزار دو ہزار سال کے بعد یقیناً موت پر فتح پالے گا"۔

میں نے کہا "پھر تو لوگ مرنے کی آرزوئیں کریں گے جوش صاحب"!

کہنے لگے: "جو کچھ بھی ہو لیکن انسان کی ذہنی اور مادی ترقی سے یہ بعید نہیں ہے۔ پہلے اس میں اس کو کامیاب ہو جانے دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ انسانی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ابھی سے آپ کیوں گھبرا رہے ہیں"؟

میں نے مرنے کی آرزو میں مرنے والی بات محض تفنن طبع کے طور پر کہی تھی۔ اس لیے ان کے جواب میں مجھے بڑا لطف آیا۔ اور پھر ہنسی آگئی۔

بات یہ ہے کہ جوش صاحب فلسفی نہیں تھے۔ وہ تو صرف شاعر تھے۔ اسی لیے ان کے فلسفیانہ خیالات و نظریات میں گہرائی نظر نہیں آتی، اور گہرائی نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس تضاد کے باوجود جوش صاحب نے حیات و کائنات کے بارے میں جو خیالات قائم کیے ہیں، وہ غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان میں زندگی کے حقائق ہیں، ان حقائق کے ہر پہلو پر جوش صاحب نے غور کیا ہے۔ ہر فلسفی کو انہوں نے پڑھا ہے اور بڑی محنت سے پڑھا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کی نہ جانے کتنی ہی کتابیں تو ان کی فرمائش پر میں نے یونیورسٹی لائبریری سے نکال کر انہیں دی ہیں اور انہوں نے ان سب کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کیا ہے۔ خیالات و نظریات میں تضاد ہونے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اکثر و بیشتر جذبات کے دھارے پر بہنے لگتے تھے۔ شاعر ان پر غالب آجاتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فلسفی سے کہیں زیادہ ایک شاعر تھے۔

جہاں تک ان کے عمرانی نظریات کا تعلق ہے، ان میں بھی فلسفیانہ نظریات ہی کا سا انداز نظر آتا ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے تھے۔ اشتراکیت ان کے خیال میں موجودہ زندگی کی کشمکش کا واحد حل تھا۔ لیکن بعض باتیں ان کے یہاں ایسی بھی ملتی ہیں جن کا اشتراکیت سے کوئی سروکار نہیں۔ بلکہ وہ تو اشتراکیت کی نفی کرتی ہیں۔ جہاں تک ان کا یہ خیال ہے کہ زندگی میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ انقلاب

کے بعد ہی ایک ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو، ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم وستم روا نہ رکھے۔ دولت کی تقسیم مساوی ہو۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سب کس طرح ہوگا اس کا جوش صاحب کو علم نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کی کشمکش کو وہ صحیح طور پر اپنے سامنے نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے ان حالات کو سمجھنے سمجھانے میں ان کا انداز سائنسی، حکیمانہ اور علمی سے زیادہ جذباتی اور شاعرانہ ہوتا تھا۔

اسی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ کبھی اشتراکیوں کے خلاف ہو جاتے تھے، کبھی موافق۔ کبھی ترقی پسندوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے تھے اور کبھی ان کی تحریک انہیں مینڈکوں کا جلوس نظر آتی تھی۔

اپنے ان خیالات میں جذباتی ہونے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ بعض معاملات میں تو ان کے خیالات کی حدیں رجعت پسندی سے جا ملتی تھیں۔ مثال کے طور پر عورت کا تصور ان کے یہاں خاصا رجعت پسندانہ ہے۔ وہ عورت کو محض تعیش اور لذت کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور سماجی زندگی میں اسے کوئی خاص حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عورت کے لیے وہ تعلیم تک کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور علم وعمل کو نسائیت کی موت خیال کرتے تھے۔

اس موضوع پر میں نے ان سے بارہا بحث کی ہے۔ بحث سے تو وہ مجھے قائل نہیں کر پائے اور جب مجھے قائل ہوتا ہوا نہیں دیکھا تو کہا اچھا میرے چند اشعار سنیے۔ آپ قائل ہو جائیں گے۔ اور یہ کہہ کر کئی بار مجھے یہ اشعار سنائے ؎

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے وہ بد دماغ جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا
دور ہی سے ایسے علم جہل پرور کو سلام حسن نسواں کو بنا دیتا ہے جو جاگیر عام
جس جگہ حوران جنت کا کیا ہے تذکرہ کیا کہا ہے اور بھی کچھ ہم نے جز حسن وحیا

تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویر جمال ہم نے کیا اُن کو کہا ہے صاحب فضل و کمال

ہیچ ہے ہر چیز زیور، غازہ افشاں رنگ، خال

حُسن ہے ہر رنگ میں خود سو کمالوں کا کمال

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار علم کا ان نرم شالوں پر کوئی رکھتا ہے بار

روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موج ماہتاب کیا کوئی اوراق گُل پر طبع کرتا ہے کتاب

میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار کاکلِ افسانہ "ہو دوش حقیقت سے دوچار

حُسن کا آغوش رنگین دلفریب و دل رُبا علم سے بن جائے اقلیدس کا محض اک دائرہ

نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شور کائنات بزم کاوش میں جلے شمع شبستانِ حیات

اور واقعی ان اشعار کو سننے کے بعد میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا ہوں۔ گویا کہ انہوں نے مجھے قائل کر دیا ہے۔ حالانکہ میں قائل نہیں ہوا۔ کون ہے جو ان اشعار کو سن کر جھومنے نہیں لگے گا اور اس پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری نہیں ہوگی۔

جوش صاحب کے خیالات و نظریات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن اپنی شاعری کے سحر سے وہ اختلافی مسائل کو بھی وقتی طور پر تسلیم کرا لیتے تھے۔

صنف لطیف کے بارے میں اس طرح کے غیر حقیقت پسندانہ خیالات رکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جوش صاحب نے ایک زمانے تک قدامت کی آغوش میں پرورش پائی۔ یہی سبب ہے کہ ان پر باوجود بعض معاملات میں انقلابی ہونے کے اپنی قدیم تہذیبی اور معاشرتی روایات کا گہرا اثر تھا اور ان روایات کی پاسداری کو وہ ضروری خیال کرتے تھے۔

روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کو اپنی آبائی امارت اور ریاست پر بھی فخر تھا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ امارت اور جاگیرداری کی ان خصوصیات کا رنگ خود جوش صاحب کی شخصیت میں بھی رچا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے آس

پاس اور گرد و پیش ایک درباری ماحول قائم رکھتے تھے۔ اس ماحول میں پوری طرح
دربار داری کی فضا تو نہیں ہوتی تھی کیونکہ جوش صاحب کی شخصیت میں حد درجہ کا
عجز وانکسار تھا۔ لیکن ان کی محفلوں میں ایک ایسا انداز ضرور ہوتا تھا۔ جس میں درباری
ماحول کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جوش صاحب کبھی تنہا نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کے
آس پاس کچھ ہم مذاق لوگوں کا جھگمٹ ضروری تھا۔ ان لوگوں سے وہ خوش گپیاں
کرتے تھے۔ لطیفے سناتے اور سنتے تھے۔ شعروشاعری ہوتی تھی اور اس طرح ان کا وقت
گزرتا تھا۔ اس محفل میں کوئی بھی شریک ہو سکتا تھا۔ لیکن اس میں شریک ہونے کے
لیے آداب محفل کا خیال ضروری تھا۔ جوش صاحب اپنی محفلوں میں ایسی حرکات کو برداشت
نہیں کر سکتے تھے جو معاشرتی اور تہذیبی روایات کے خلاف ہوں۔ اسی لیے ان محفلوں
میں بے تکلف ہونے کے باوجود وہ ایک مخصوص دائرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔
چند حدود بہر حال قائم رکھتے تھے۔

جوش صاحب بڑے ہی سچے، بے باک نڈر اور صاف گو آدمی تھے۔ اپنی نجی
محفلوں میں وہ ایسی باتیں بھی کرتے تھے جو ناگفتنی ہوتی تھیں۔ اپنی جوانی کے واقعات
اس طرح بیان کر دیتے تھے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ انہیں یہ خیال کبھی بھی نہیں آتا تھا
بعض واقعات بیان کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ "یادوں کی برات" میں بعض واقعات
انہوں نے ایسے بھی بیان کر دیئے ہیں جن کو بیان نہ کرتے تو اچھا تھا۔ لیکن وہ تو جوش
صاحب تھے، انہیں کون روک سکتا تھا۔ وہ تو کہئے کہ خاصی تعداد میں اس قسم کے
واقعات کو ان کے بعض احباب نے قلم زد کر دیا، ورنہ اگر وہ سب چھپ جاتے
تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

چند سال جوش صاحب نے ریاست حیدر آباد میں گزارے۔ ملازمت کے
سلسلے میں وہاں گئے تھے۔ کچھ واقعات وہاں ایسے پیش آئے کہ انہوں نے ان کو محفلوں

یں کھلم کھلا بیان کیا، اور پھر نظام کے خلاف ایک نظم لکھ دی۔ جس پر عتاب نازل ہوا۔ ملک بدر ہونے کا فرمان جاری ہوا۔ ریاست کے تمام بڑے بڑے لوگوں نے کہا کہ رسمًا معافی مانگ لیجیئے۔ فرمان واپس لے لیا جائے گا۔لیکن جوش صاحب نے ایک نہ سُنی۔ راتوں رات حیدر آباد چھوڑ دیا۔

اس زمانے کے واقعات وہ اکثر مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

جوش صاحب انگریزوں کے دشمن تھے۔کیونکہ اُنھوں نے چالبازی اور مکاری سے ہندوستان کو غلام بنایا تھا، اور اس جنت نشان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو جوش صاحب نے انگریزی سامراج کے خلاف ایک بڑی ہی سخت نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" لکھی، جس کو اس وقت کی برطانوی حکومت نے ضبط کرلیا، اور اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ جوش صاحب اپنی محفلوں میں اس نظم کا تذکرہ کرتے رہے، اور نجی محفلوں میں اس کو سناتے رہے۔ اس سلسلے یں ان کی گھر کی تلاشی بھی ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اس واقعے پر ایک نظم "تلاشی" لکھی، کیا خوب نظم تھی ؎

جس سے امیدوں یں بجلی آگ ارمانوں یں ہے

اے حکومت! کیا وہ شے اِن میز کے خانوں یں ہے

بند پانی میں سفینہ کھے رہی ہے کس لیے

تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لیے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد

آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مُراد

جس کے اندر دہشتیں پُر ہول طوفانوں کی ہیں

لرزہ افگاں آندھیاں جس میں بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمنِ ہندوستاں
شیر جس میں ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسرِ وارنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی
جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھائے وہ آگ
نارِ دوزخ کو پسینہ جس سے آجائے وہ آگ
موت جس میں دیکھتی ہے منہ اُس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

بعض لوگوں کو جوش صاحب کا پاکستان آنا، اور مستقل طور پر یہاں قیام کرنا ناگوار گذرا۔ چنانچہ بات کا بتنگڑ بنایا گیا، اور ان کے خلاف باتیں ہوئیں۔ جوش صاحب نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔ ہر محفل میں وہ اس مخالفت کا ذکر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "جواہر لال مجھے واپس بلانا چاہتے تھے۔ کہتے تھے چھ لاکھ روپے کی جاگیر واگذاشت کروادیں گے، لیکن میں نے ہمیشہ ان سے یہی کہا ہے کہ میں وہاں رہوں گا جہاں میری تہذیب اور میری زبان زندہ ہے، چھ لاکھ روپے لے کر میں کیا کروں گا۔ کب تک چلیں گے، یہ چھ لاکھ، لیکن یہاں مجھے آسودگی ہے۔ اس لیے کہ میرے ہم زباں ہم خیال میری تہذیب کے علم بردار یہاں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جواہر لال میرے دوست ہیں لیکن وہ خود اس تہذیب اور زبان کو ہندوستان میں زندہ نہیں رکھ سکتے جس کے وہ علم بردار ہیں"۔

جوش صاحب کی بے باکی اور صاف گوئی کے سلسلے میں ایک واقعہ اور بھی مجھے یاد ہے، اور میں اس کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔ جب جوش صاحب دلی میں تھے اور حکومت ہند کی ملازمت میں تھے تجھو صنہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے انہیں کشمیر بلایا تاکہ وہ

اپنی نظم "حرف آخر" وہاں رہ کر مکمل کریں۔ جوش صاحب کئی مہینے وہاں رہے۔ اور جب دلی واپس آئے تو ہر محفل میں یہ کہتے تھے کہ "صاحب! کشمیر تو پاکستان میں جائے گا۔ وہ پاکستان کا حصّہ ہے۔ میں نے کشمیر میں جس شخص سے بھی پوچھا، اس نے یہی کہا کہ ووٹ ہم پاکستان کو دیں گے۔"

جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند جوش صاحب کی یہ باتیں سُن کر پریشان ہوئے اور ذاتی طور پر اُن سے یہ کہا کہ آپ محفلوں میں اس قسم کی باتیں نہ کیجئے۔ یہ نازک مسئلہ ہے لیکن جوش صاحب نے ایک نہ سُنی اور دلی کی ہر محفل میں یہ باتیں کرتے رہے۔

جوش صاحب کو پوری طرح بے تکلف تو ان کے چند مخصوص احباب ہی میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان احباب سے وہ محبت کرتے تھے۔ ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتے تھے، اور ان کے سامنے وہ کسی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہیں کے ساتھ ان کے وقت کا بیشتر حصّہ گزرتا تھا۔ وہ ان احباب سے بے تکلف ہوتے تھے اور اس بے تکلفی میں پرانے واقعات کو بیان کیا جاتا تھا۔ عشق و عاشقی کی باتیں بیان کی جاتی تھیں۔ لطیفوں کا دور دورہ ہوتا تھا۔ یہ محفلیں صرف بذلہ سنجیوں کے لیے مخصوص ہوتی تھیں۔ سنجیدہ گفتگو ان محفلوں میں نام کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ جوش صاحب ان احباب کی خاطر کرتے تھے۔ انہیں کھلاتے پلاتے تھے۔ ان کے لیے دلچسپیوں کے مختلف سامان فراہم کرتے تھے، اور اس طرح ان کی یہ محفلیں خاصی پُر لطف بن جاتی تھیں۔

یوں احباب کے معاملے میں جوش صاحب زود رنج نہیں تھے۔ شاید ہی وہ اپنے کسی دوست سے کسی بات پر ناراض ہوتے ہوں۔ البتہ کبھی کبھی عالم سرور میں ان کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ وہ بھی اس عالم میں جب کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو اور جس کی وجہ سے انہیں یہ خیال گزرے کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا ہے۔

کئی سال کی بات ہے ایک بے تکلف دوست دلی آئے۔ جوش صاحب نے مجھے

اور انہیں شام کے کھانے پر بلایا اور یہ کہا کہ کھانے کے بعد وہ اپنا تازہ کلام بھی سنائیں گے۔ ایسا کلام جس کے چھپنے کی اس زمانے میں حکومت کی طرف سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ جوش صاحب نے یہ تاکید بھی کر دی تھی،

آپ لوگ ساڑھے سات بجے تک ضرور پہنچ جایئے گا ورنہ اس کے بعد ان کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ اس دن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہمیں ان کے یہاں پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ ہم شراب تو پیتے نہیں۔ اس لیے ذرا اطمینان سے چلیں گے۔ ہماری عدم موجودگی میں اُن کے دو ایک دور ہو جائیں گے تو مناسب ہو گا۔ بہر حال ہم لوگ کوئی سوا آٹھ بجے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ جوش صاحب بڑی ہی برہمی کے عالم میں بیٹھے ہیں۔ ان کا موڈ ہمارے دیر میں پہنچنے سے خراب ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی برسنے لگے۔

"اچھا تو آپ لوگ تشریف لے آئے!

میں نے کہا "جوش صاحب! ہم لوگ بہت شرمندہ ہیں، ہمیں دیر ہو گئی۔ راستے میں ایک صاحب نے پکڑ لیا۔ لاکھ کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی، اور ہمیں نہ چھوڑا۔

جوش صاحب کہنے لگے "آپ لوگ مجھے گولی مار دیجیے۔ قتل کر دیجیے"۔

اس پر مجھے ہنسی آگئی لیکن میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا، "جوش صاحب! ہم لوگ معذرت خواہ ہیں۔ آپ ہمیں معاف کر دیجیے"۔

انہوں نے پھر کہا "جب دوست کو دوست کا خیال نہ رہے تو دوست کو چاہیئے کہ دوست کو گولی مار دے"۔

ان باتوں میں ہلکی سی خفگی ضرور تھی لیکن دراصل یہ باتیں وہ انتہائی محبت میں کہہ رہے تھے۔

میں نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی اور کہا "جوش صاحب، اب وہ کلام سُنا

دیجیے جس کے سنانے کا آپ نے وعدہ کیا تھا" کہنے لگے "اب میں کلام کیسے سناؤں؟ جب دوست دوست کو دوست ہی نہ سمجھے تو اُسے کلام سنانے سے کیا حاصل"؟

غرض دیر تک وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے درصل وہ تنہائی سے بیزار تھے۔ ہمارے دیر میں پہنچنے سے ان کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں منایا اور منانے کے بعد پھر دیر تک ان کا کلام سُنا۔ بے تکلف احباب ہی کے ساتھ جوش صاحب کبھی کبھی اس طرح بگڑ لیتے تھے۔ ورنہ کسی اور کے ساتھ انہیں بگڑنا نہیں آتا تھا۔ ناراض ہونا تو وہ سرے سے جانتے ہی نہیں تھے۔ صرف بے تکلف احباب ہی سے وہ کبھی کبھی ناراض ہو لیتے تھے۔ لیکن ان کے اس ناراض ہونے میں بھی حد درجہ محبت ہوتی تھی۔

جوش صاحب کے یہ بے تکلف احباب جب یک جا ہو کر بیٹھتے تھے تو رندی اور قلندری کی یادوں کو تازہ کرتے تھے۔ اس رندی اور قلندری کے بغیر جوش صاحب زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کے مزاج کا جُز تھا۔ اس کے بغیر انہیں گھٹن کا سا احساس ہوتا تھا۔ سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا اسی لیے تو جوش صاحب ہر وقت ایک رند اور قلندر نظر آتے تھے۔ ان سے اس رندی اور قلندری کو الگ کر لیجیے تو ان کا وجود خطرے میں نظر آتا تھا۔

شاعر انقلاب کے مزاج میں رندی اور قلندری ضرور تھی۔ انہوں نے اس رندی اور قلندری کو اپنی شخصیت پر طاری بھی کر لیا تھا لیکن ان کی شخصیت کی اس خصوصیت نے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بیگانہ نہیں کیا۔ وہ اس رندی کے باوجود اپنی گھریلو زندگی میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ یوں یہ اور بات ہے کہ شادی شدہ زندگی کو وہ ہمیشہ صلواتیں، سناتے رہتے تھے۔ کہتے تھے "یہ زندگی انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ شوخی اور شگفتگی کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ انسان کسی کام کا نہیں رہتا چنانچہ جب بھی کوئی نوجوان ان سے ملتا تو وہ اس موضوع پر اس سے گفتگو ضرور کرتے تھے۔ پوچھتے

تھے کیوں صاحب آپ نے شادی کی یا نہیں؟" اگر اس نے کہا "جی ہاں" تو ان کے منہ سے نکلتا "الحمدللہ آپ اس لعنت سے محفوظ ہیں۔ ہرگز شادی نہ کیجیے گا انسان کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ کولھو کا بیل بن کر رہ جاتا ہے"۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی تھی جس کو وہ اکثر نوجوانوں کو سنا دیتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ان کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی ان کی یہ گھریلو زندگی رندی اور قلندری کی راہوں میں حائل ضرور ہوتی تھی لیکن انہوں نے اس کے باوجود اس زندگی کی مسرتوں کو محسوس کیا تھا۔ اور وہ اس کی اہمیت کے قائل تھے۔ اسی لیے ان کی گھریلو زندگی خوشگوار رہی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اہلیہ اور بچوں کا خیال رکھا۔ انہیں ان سب سے ٹوٹ کر محبت کی۔ اگر کسی سے وہ اس زندگی میں خوف کھاتے تھے تو وہ ان کی اہلیہ تھیں جنہیں وہ انھیں "ام الشعراء" کہتے تھے۔ انہوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب تک ان کا خاتمہ ہو چکا ہوتا اگر ان کی اہلیہ ان کی غیر معتدل زندگی میں اعتدال نہ پیدا کرتیں۔ اسی لیے وہ کہتے تھے "میری بیوی نے اپنی سخت گیری سے جو توازن میرے اندر پیدا کر رکھا ہے اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے"۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جب بھی وہ زندگی میں غلط راستے پر چلے تو ام الشعراء نے اس پر چلنے سے انہیں روکا۔ جب بھی انھوں نے حد سے تجاوز کیا تو انہوں نے بُری طرح اُن کی خبر لی۔ جب بھی وہ اعتدال اور توازن سے ہٹے تو انہوں نے اُن کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ طبیعت ٹھکانے ہو گئی۔ اپنی اولاد کو انہوں نے ہمیشہ عزیز رکھا۔ اس حد تک کہ لڑکی اور داماد کو انہوں نے ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھا۔ گھریلو زندگی کا اس قدر خوشگوار ہونا جوش صاحب کے ایسے انسان کے لیے کسی حد تک عجیب ضرور ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جوش صاحب کی زندگی کے اس پہلو نے ان کی شخصیت کو عظمت سے ہم کنار ہونے

میں بڑی مدد کی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جوشؔ صاحب شاہد شراب کے دلدادہ اور والا و شیدا تھے اور وہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ انہیں کے لیے جیتے تھے۔ انہیں کے سہارے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتے تھے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی میں ہر وقت شاہد و شراب کا دور دورہ نہیں رہتا تھا۔ شام کا وقت اسی کام کے لیے ہوتا تھا۔ غروب آفتاب کے ساتھ جیسے ہی شام کی سیاہی چھانے لگتی تھی وہ محفلِ نائے و نوش کو آراستہ کر لیتے تھے۔ دن بھر انہیں اس محفل کے آراستہ کرنے کا خیال رہتا تھا اور وہ اسی خیال میں دن کا سفر طے کر کے شام کی منزل تک پہنچتے تھے۔ بقول ان کے شام ہی کا وقت ایسا ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو پانے کی کوشش کرتا ہوں، ورنہ دن بھر تو بھٹکتے ہی گزرتی ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ شام کے وقت انہیں دیکھ کر یہی احساس ہوتا تھا جیسے واقعی کسی بھولے بھٹکے ہوئے راہی کو منزل سے ہم کنار ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دن بھر کی بے چینی اور اضطراب کے بعد یہی وقت ہوتا تھا جب مسرت ان پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی تھی۔ اور وہ اس میں اپنے آپ کو غرق کر دیتے تھے۔

جوشؔ صاحب شام کے وقت کو مسرت، راحت اور آرام کا وقت سمجھتے تھے۔ اس وقت وہ کوئی سنجیدہ بات، کوئی علمی گفتگو کرنے اور سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت تو ان کے خیال میں صرف مسرتوں سے اپنی جھولیوں کو بھرنا چاہیئے۔ زندگی سے رس نچوڑنا چاہیئے کیونکہ اس وقت زندگی انہیں باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔

دلی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے!

قیام پاکستان سے قبل اتفاق سے دلی میں اردو، ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلوگو، ملیالم، کناڈی، تمام زبانوں کے بعض مشہور ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ان

سب کو یکجا کرنے کی ایک صورت نکالی گئی تاکہ باہم تبادلہ خیالات سے ہر ایک کو دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ اس کام کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس کا ایک جلسہ سہ پہر کے وقت منعقد ہوا۔ تمام زبانوں کے ادیب اس میں شریک ہوئے۔ یہ ایک تاریخی جلسہ تھا۔ مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ جوش صاحب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ آخر میں بعض لوگوں نے یہ اصرار کیا کہ جوش صاحب ادب اور مسرت کے رشتے پر روشنی ڈالیں، لیکن شام ہو چکی تھی۔ اس لیے جوش صاحب پر بے چینی اور اضطراب کا عالم تھا۔ فرمائش پر کہنے لگے "صاحب آپ حضرات دیکھتے ہیں اس وقت، کائنات کی ہر چیز آرام اور سکون چاہتی ہے۔ لیکن آپ اس وقت مجھے سنجیدہ علمی گفتگو میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ اس وقت تو میرا جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی مست شباب میرے سامنے رقص کرے۔ اس کے پائل کی جھنکار مسرت کے تمام رازوں کو آپ کے سامنے آشکار کر دے گی۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح محفل برخاست ہو گئی۔ سب لوگ شاعر انقلاب کی اس بات پر خوش خوش رخصت ہوئے۔ کیونکہ جو کچھ جوش صاحب کہنا چاہتے تھے وہ انہوں نے صرف ایک فقرے میں کہہ دیا تھا۔

شام کے وقت جوش صاحب اکثر اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر کام کا ایک وقت ہونا چاہیے اور شام کے وقت سوائے شاہد و شراب سے دلچسپی لینے کے ان کے خیال میں اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اِس لیے شام ہوتے ہی جوش صاحب کی محفل جم جاتی تھی اور مئے و مینا کا رقص شروع ہو جاتا تھا۔ جوش صاحب خود بھی پیتے تھے اور پینے والے احباب کو بھی پلاتے تھے۔ لیکن جو لوگ نہیں پیتے تھے ان سے کبھی اصرار نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ بہت محتاط تھے۔ جو لوگ شراب سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اسی لیے ہم

لوگوں کو تو انہوں نے "بچہ پارٹی" کا خطاب دے رکھا تھا۔ یہ خطاب ایک بڑی ہی رنگین اور پرکیف محفل میں دیا گیا۔

ایک شب کو نئی دلی میں ایک صاحب نے ان کو دعوت شراب دی تھی۔ حالانکہ وہ تنہا مدعو تھے لیکن انہوں نے مجھ سے اور بعض دوسرے احباب سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ جوش صاحب کے مزاج میں یہ بات داخل تھی کہ وہ کبھی تنہا کسی دعوت میں نہیں جاتے تھے۔ احباب کو ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ ان کی دعوت کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جو احباب بھی اس وقت ان کے ساتھ ہوں، ان سب کی دعوت ہے۔ چنانچہ جوش صاحب ہمیں زبردستی اس دعوت میں لے گئے۔ ہم لوگ اس جگہ پہنچے تو دیکھا رنگ و بو کا ایک طوفان ہے جو وہاں اٹھا ہوا ہے۔ نازنینان عشوہ کار کا ایک جھرمٹ ہے اور ان کے قریب ہی ایک میز پر قرینے سے رنگ رنگ کی شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں مجھے وہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، جوش صاحب نے پہنچ کر ہمارا تعارف کرایا۔ اور ہم اس رسمی تعارف کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے گزرنے نہیں پائے تھے کہ ایک صاحبہ نے سب کے ساتھ ہمارے سامنے بھی شراب کے گلاس پیش کیے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا اور معاً میرے منہ سے نکلا،

"شکریہ معذرت خواہ ہوں"۔

جواب ملا، "اچھا تو آپ شوق نہیں فرماتے"۔

میں نے کہا۔ "جی نہیں۔ محروم ہیں ہم پیتے نہیں صرف دیکھتے ہیں۔

"لیکن دیکھنے سے کیا فائدہ ؟

میں نے جواب دیا "نشہ تو دیکھنے سے بھی ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت بھی نشے میں ہوں" اس پردہ صاحبہ کچھ شرما سی گئیں، چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی۔ اس وقت

تک جوش صاحب گلاس ہاتھ میں لے چکے تھے اور اس گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جب ان صاحبہ کو شرماتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے، صاحب! انہیں معاف ہی کر دیجئے۔ صحیح ہے کہ یہ پیتے پلاتے نہیں۔ صرف دیکھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں دیکھنے ہی سے انہیں نشہ ہو جاتا ہے اصل میں یہ "بچہ پارٹی" ہیں۔

اس پر تمام حاضرین ہنسنے لگے!

خیر، یہ تو ضمنی بات تھی، میں کہہ رہا تھا کہ یہ "بچہ پارٹی" نائے ونوش کی محفلوں میں بھی جوش صاحب کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن وہ ان سے شراب پینے کے لیے اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی چائے پینے اور کچھ کھانے پر اصرار کرتے تھے۔ بس تو پھر ایسی محفلوں میں یہ ہوتا تھا کہ جوش صاحب تو پیتے تھے اور "بچہ پارٹی" کھانے میں مصروف رہتی تھی اور جوش صاحب اس پر خوش ہوتے تھے کیونکہ نوجوانوں کا شراب پینا انہیں خود بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا، وہ اس چیز کو ان کے لیے صحیح معنوں میں ام الخبائث سمجھتے تھے۔ لیکن اس موضوع پر دلچسپ باتیں ضرور کرتے تھے۔ ایک شام اپنی مخصوص محفل میں جوش صاحب کہنے لگے "عبادت صاحب، ایک دن نہا دھو کر آیئے"۔

میں نے کہا "خیریت تو ہے آپ کو اس وقت نہا دھو کر آنے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟

کہنے لگے "نہا دھو کر آیئے تو پھر بتاؤں گا پہلے وعدہ کیجئے"۔

میں نے کہا "اچھا میں وعدہ کرتا ہوں لیکن پھر ہو گا کیا؟"

"کہنے لگے "ہو گا کیا؟ صرف یہ ہو گا کہ اس طرح آپ کا کفر ٹوٹے گا۔

یہ چیز بڑی ہی پاکیزگی کا تقاضا کرتی ہے"۔

میں نے کہا "بے شک صحیح ہے، جب ہی تو یہ ہمارے ایسے تر دامن اور گناہگار اس کے پاس نہیں پھٹکتے"۔

جوش صاحب ہنس کر کہنے لگے "آپ کا کفر نہیں ٹوٹے گا"۔

میں نے کہا "جوش صاحب، ہم نے تو جنت ہی میں پینے کی قسم کھائی ہے"۔
کہنے لگے "سنیے اپنی ایک رباعی یاد آگئی۔

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری　　بے چارے کی اک شب نہ سہانی گزری
جنت کی دعاؤں میں بڑھاپا کاٹا　　حوروں کی تمنا میں جوانی گزری

غرض اپنی مخصوص محفلوں میں جوش صاحب اس طرح کی بے شمار باتیں کرتے تھے اور ان کی یہ باتیں لطف سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔

جوش صاحب کبھی تنہا شراب نہیں پیتے تھے۔ "تنہا شراب پینے سے شراب کا اثر زائل ہو جاتا ہے ماضی کی تمام تصویریں بھوت بن کر شراب پینے والے کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر ڈرتا ہے۔ اس کام کے لیے تو ایک خاص فضا کا ہونا ضروری ہے" اس لیے جوش صاحب اپنے ہم مشربوں کو جمع کر کے شام کے وقت محفل سجاتے تھے میں نے جوش صاحب کو شراب پینے کے بعد بہکتے ہوئے بہت ہی کم دیکھا ہے نشے کے عالم میں وہ موٹر تک چلاتے تھے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اعصاب مضبوط ہیں اور اعصاب مضبوط اس وجہ سے ہیں کہ شراب کے معاملے میں انہوں نے زندگی بھر اعتدال سے کام لیا۔ وہ خود کہتے تھے "شراب مجھ پر حاوی نہیں ہو سکی ہے بلکہ میں شراب پر حاوی ہو گیا ہوں، اسی لیے وہ شراب پینے کے بعد نشے کے عالم میں موٹر تک چلا سکتے تھے۔ میں تو جب بھی اس عالم میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھا ہوں تو میری جان نکل گئی ہے۔ لیکن کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

شراب کا نشہ جوش صاحب پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ اس عالم سرخوشی میں ان کی باتیں سننے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسی عالم سرخوشی میں وہ اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کرتے تھے۔ لطیفے سناتے تھے، کلام سامعین کو لطف اندوز کرتے تھے، اور اس طرح ان کی یہ محفلیں باغ و بہار بن جاتی تھیں۔

جوش صاحب کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع

نہیں ہوتا تھا!

میں نے ایک دن جوش صاحب سے پوچھا "آپ کو یہ شراب کی عادت کیسے پڑی- ہمارے ہاں تو اس کو بہت ہی بُرا سمجھا جاتا ہے"۔

جوش صاحب کہنے لگے "کیا بتاؤں صاحب! ایک شخص کی ضد اس قبیح عادت کا باعث بنی، اور ہم اس کے شکار ہو گئے"۔

میں نے کہا "کس طرح"؟

کہنے لگے "میری عمر کوئی اٹھارہ انیس سال کی تھی کہ مجھے دھولپور جانا پڑا- وہاں میں مہاراجہ دھولپور کا مہمان تھا- وہ میرے سامنے جام پر جام چڑھاتے تھے، اور مجھ سے بھی اصرار کرتے تھے، لیکن میرے دل میں اس "اُم الخبائث" کا ڈر کچھ اس طرح بٹھا دیا گیا تھا کہ میں اس کو دیکھ کر ڈرتا تھا- جب میں کسی طرح ان کے اصرار کے باوجود اس کام پر آمادہ نہیں ہوا، تو انہوں نے ترغیب کے لیے ایک عجیب صورت پیدا کی- میں رات کو جب آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں گیا، تو تھوڑی دیر میں دروازے پر کسی نے دستک دی- میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک مہ جبین عشوہ کار، کوئی، سولہ سترہ سال کا سِن، راجستھانی لباس میں ملبوس چھم چھم کرتی میرے کمرے میں داخل ہوئی- میں گھبرا گیا لیکن چند لمحوں میں اس کے حُسن و شباب نے اپنے عشوہ و ناز و ادا سے میرا دل موہ لیا، اور میں آپے سے باہر ہو گیا- اُس نے اصرار کر کے، بلکہ ضد کر کے ایک دو جام پلائے، میں اپنے ہوش ہی میں نہیں تھا، اس لیے جو کچھ اُس نے کہا، وہ کرتا گیا- بس وہ دن آج کا دن، یہ کافر منہ سے ایسی لگی کہ آج تک نہ چھٹی — میں اس کا غلام بن گیا — مہاراجہ صاحب دھولپور کی ضد پوری ہو گئی، اور میں اس کا اسیر ہو گیا— ویسے آج بھی میں پچھتاتا ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا- واقعی یہ بُری چیز ہے، اُم الخبائث ہے- یہ اور بات ہے کہ میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی، اپنے آپ کو حدود کے اندر رکھا، یہ چیز مجھ پر

سوار نہ ہو سکی، میں نے اس کو اپنی گرفت میں رکھا اور اس میں ایک ایسی باقاعدگی پیدا کی۔ جو عام طور پر ممکن نہیں۔ کبھی دن میں یہ شغل نہیں کیا۔ میں تو بس غروب کے بعد طلوع ہوتا ہوں اور تین چار جام سے زیادہ کبھی نہیں پیتا۔ اس باقاعدگی میں ام الشعراء یعنی میری اہلیہ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ نہ ہوتیں تو میں کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔"

شاعر انقلاب کی زندگی میں یوں بڑا اعتدال تھا۔ شراب نوشی تک میں جو اعتدال سے کام لے اس کی بڑائی سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس اعتدال کے باوجود، مجموعی طور پر دیکھا جائے، تو ان کی زندگی میں خاصا لاابالی پن نظر آتا تھا۔ ایک ایسا لاابالی پن جس کی جھلک ہر جینیس میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ یوں دیکھیئے تو شاعر انقلاب کی شخصیت میں بڑی باقاعدگی کا احساس ہوتا ہے ان کے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفان میں صبح کو طرف چمن و کوئے بیاباں میں، شام کو رحمت کدہ بادہ فروشاں میں اور رات کو بزم طرب و کوچہ خوباں میں نظر آتے تھے۔ ان معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا، لیکن اس باقاعدگی کے باوجود ان کے مزاج میں بے قاعدگی بھی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عملی آدمی نہیں تھے۔ وہ حد درجہ جذباتی، تخیلی اور رومانی تھے۔ انہیں کسی ایک جگہ پر قرار نہیں تھا۔ ان کے مزاج میں ایک سیمابی کیفیت تھی۔ اسی لیے وہ جم کر کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ سوچتے بہت کچھ تھے۔ لیکن کرتے کچھ نہیں تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک فطری لاپروائی تھی۔ جو شاعروں میں ضرور ہوتی ہے۔ اس لاپروائی نے انہیں زندگی میں بہت نقصان پہنچایا۔ ان کی ساری جائیداد اسی لاپروائی کی بھینٹ چڑھ گئی جائیداد کے سلسلے میں جو مقدمے وغیرہ ہوئے تھے۔ ان کی پیروی جس طرح ہونی چاہیئے وہ ان سے نہ ہو سکی۔ مقدمات کی پیشی کی تاریخ گزر جانے کے بعد انہیں پیشی کی تاریخ کا خیال آتا تھا۔ ان حالات میں پیروی بھلا کیا ہو سکتی تھی؟ سوائے شاعری کے انہوں نے کسی کام کی طرف بھی سنجیدگی سے

توجہ نہیں کی۔ تن آسانی اور آرام طلبی بھی ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ وہ عملی زندگی میں محنت اور جفاکشی سے بہت جلد گھبرا جاتے تھے۔

یہ تمام باتیں ان کی شخصیت میں موجود تھیں انہیں خود بھی اس کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنی ان خامیوں کو چھپاتے بھی نہیں تھے۔ ان خامیوں کا ذکر کر کے انہیں اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے، اور ملامت تو وہ اپنے آپ کو بہت کرتے تھے۔ اپنی کوئی بھی خامی ذہن میں آئے یا کسی کمزوری کا احساس ہو تو بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھتے تھے کہ "صاحب، ہم بڑے نالائق ہیں۔ ہمیں تو مر جانا چاہیئے تھا۔ ہمیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں! وہ تو کہیئے 'ام الشعر' ہمارے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی باقاعدگی سے بچائے رکھا اور ہم زندہ رہے"۔

جوش صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر اور فن کار تھے اور ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کی یہی شاعری اور فن کاری ہے۔ جہاں تک اس شاعری اور فن کاری کا تعلق ہے، ان کی شخصیت اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ صورت سے، انداز سے، چال ڈھال، گفتگو سے وہ شاعر اور صرف شاعر معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت میں بانکپن اور طرح داری سے ملی جلی وہ جو ایک طرح کی معصومیت، اور سادگی تھی، وہ اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہے۔ ہوش مند اور باشعور ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں وہ جو ہر چیز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھنے والی کیفیت تھی۔ اس سے بھی یہ خیال صحیح ثابت ہوتا ہے۔ باوقار ہونے کے باوصف ان کی شخصیت میں وہ جو آن کی آن میں ہر حسین چیز پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا انداز تھا، اس سے بھی اس خیال پر صداقت کی مہر لگتی ہے۔

غرض ان کی ہر بات سے شاعر اور فن کار ہونا ٹپکتا تھا۔ اسی لیے میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جوش صاحب کے اس لاابالی پن کو برداشت کر لیتے تھے۔ جن کے نزدیک مزاج باقاعدگی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اسی لیے جوش صاحب کے پرستار دل

یں رندان بادہ خوار اور عاشقان جنون کوش سے لیکر زاہدان خشک اور عابدان شب زندہ دار تک شامل نظر آتے تھے۔ ایک شخص جو اُن سے ایک بار مل لیتا تھا۔ ان کی جاذب نظر اور دل میں کھب جانے والی شخصیت کا دلدادہ ہو جاتا تھا۔ اور پھر ساری زندگی ان کا دلدادہ ہی رہتا تھا۔

جوش صاحب کی اس رنگا رنگ، پرکیف، اور دلآویز شخصیت میں ان کی شاعرانہ عظمت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اسے چار چاند لگا دیئے۔ وہ ایک انسان دوست ہی کی حیثیت سے عظیم نہیں تھے، ایک شاعر اور فن کار کی حیثیت سے بھی عظیم تھے۔ اور ان کی اس شاعرانہ اور فن کارانہ عظمت کا راز انسانی زندگی کے شدید احساس، گہرے شعور، اور اس احساس و شعور کے ہاتھوں پیدا ہونے والے افکار و خیالات کے حسین اظہار میں مضمر ہے۔ جوش صاحب نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی اور اس کے متنوع پہلوؤں کو جس طرح شدت احساس اور گرمیٔ جذبات کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی مثال اردو تو کیا دوسری زبانوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گی جوش صاحب کی شاعری اردو ہی میں اضافہ نہیں، دنیا بھر کے ادب میں ایک اضافہ ہے۔ انسانی زندگی کا کون سا پہلو ہے جو اس میں موجود نہیں۔ اس میں انسان ہے اس کی دلچسپیاں ہیں، اُس کی آرزوئیں ہیں، اس کی تمنائیں ہیں، اس کی حسرتیں ہیں، اس کی ناکامیاں اور کامرانیاں ہیں۔ غرض وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی زندگی میں ہوتا ہے، اور جس کو انسانی زندگی میں ہونا چاہیئے، جوش صاحب اسی انسانی زندگی کے شاعر تھے۔ وہ شاعر انقلاب ضرور تھے۔ شاعر شباب بھی ان کو کہا گیا ہے، لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ان دونوں سے کہیں زیادہ شاعر حیات کا لقب ان کو زیب دیتا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری

یہ ۱۹۴۳ء کا قصہ ہے!

میں ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کر چکا تھا، اور میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے کر "اردو تنقید" پر کام شروع کر دیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال تک میں نے اپنے موضوع سے متعلق کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کی تھی، اور اچھا خاصا مواد جمع کر لیا تھا، لیکن لکھنے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی، یا یوں کہئے کہ ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مواد کا ایک سمندر تھا میں جس کی لہروں کے رحم وکرم پر تھا۔ خود اعتمادی میرے اندر نام کو نہیں تھی۔ اور میں اس احساس کا شکار تھا کہ مواد کو سمیٹنا اور اس کو تحریر میں لانا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔

اس زمانے میں نیاز صاحب کے لکھنے کی دھوم تھی، اور لکھنؤ کے لکھے پڑھے حلقوں میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ جس موضوع پر چاہیں قلم اٹھا سکتے ہیں، افسانہ، ناول تنقید، مذہبی امور، دینی معاملات، ادبی مسائل — ان سب پر وہ پورا رسالہ خود لکھ کر

چھاپ سکتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ لیکن میں ایک معمولی طالب علم تھا، اور نیاز صاحب مانے ہوئے۔ عالم، مفکر، ادیب اور صاحب طرز انشاء پرداز۔ ان کے مضامین پڑھتا تھا۔ نگار، کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا تھا۔ لیکن، اس کے باوجود کہ نیاز صاحب کا قیام لکھنؤ میں تھا، ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

یہ خیال اُس زمانے میں ضرور پیدا ہوتا تھا کہ نیاز صاحب سے کسی طرح ملنا چاہیئے خیال کی یہی لہر مجھے کئی بار ان کے مکان اور دفتر کی طرف لے گئی۔ لیکن میں ان کے گھر اور دفتر کو دور سے دیکھ کر، اور اس کا طواف کر کے واپس آ گیا۔

ایک شام میں نے یہ تہیہ کیا کہ اُن کے گھر جا کر آج ضرور گھنٹی بجاؤں گا، اور نیاز صاحب سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایک دن 'نیا گاؤں'، میں چٹرجی روڈ پر اُن کے مکان کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبا یا۔ ایک لمحے میں ایک صاحب ڈریسنگ گاؤن زیب تن کیے، ٹرکش کیپ پہنے باہر آئے۔ بھرا بھرا گول بلکہ چوکور سا چہرہ میانہ قد، گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگ، آنکھوں میں چمک، چہرے پر عالمانہ سنجیدگی اور انداز میں باوقار کیفیت۔

کہنے لگے "فرمائیے"

میں نے کہا "نیاز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ علمی استفادہ کرنے کی خواہش ہے۔

فرمایا "میں ہی نیاز فتح پوری ہوں۔ اندر آئیے۔"

میں نے اپنی سائیکل باہر کھڑی کی تالا لگایا اور اندر پہنچا۔ نیاز صاحب نے مجھے بڑی شفقت اور محبت سے بٹھایا، خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے"۔ اور باتیں کرنے لگے۔

پوچھا "آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں"؟

میں نے جواب دیا "پی۔ ایچ ڈی کا طالب علم ہوں۔ اردو تنقید پر تحقیقی کام کر رہا ہوں۔

کہنے لگے "آپ نے بہت اچھا موضوع منتخب کیا ہے۔ اس موضوع پر آج تک کوئی کام نہیں ہوا۔ آپ کی کتاب جب چھپے گی تو یقیناً اُس کی حیثیت سنگِ میل کی ہو گی۔ یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں کے نصابوں میں اُس کو داخل کیا جائے گا۔ اور عرصۂ دراز تک ادب اور تنقید سے دلچسپی لینے والے اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔"

میں یہ سب کچھ سُن کر پریشان سا ہو گیا، اور سوچنے لگا کہ ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں لکھا، اور نیاز صاحب نے ابھی سے میرے کام کے ساتھ اتنی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

میں نے فوراً اظہارِ مدعا کیا، اور کہا "میں آج اسی سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے اور علمی استفادے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے مواد تو اچھا خاصا جمع کر لیا ہے۔ اُردو فارسی اور انگریزی کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تنقیدی تحریروں کو دیکھ لیا ہے لیکن لکھنے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی، کچھ جھجک سی ہے۔ آپ رہنمائی فرمائیے۔"

نیاز صاحب کہنے لگے "لکھنا ایک عادت ہے۔ بس آپ لکھنا شروع کر دیجیے۔ یہ نہ سوچیے کہ کیسا لکھ رہے ہیں۔ بس لکھتے جائیے، بعد میں پڑھیے گا اور دیکھیے گا کہ آپ نے کیسا لکھا ہے۔ کاٹ چھانٹ تو لکھنے میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ لکھنا ایک فن ہے، ایک ہُنر ہے۔ آتے آتے آتا ہے۔ یہ فن محنت چاہتا ہے اور مشق کا تقاضا کرتا ہے اور محنت اور مشق لکھنے کو عادت بنا دیتی ہے۔"

نیاز صاحب کی یہ باتیں شفقت اور محبت میں کچھ اس طرح ڈوبی ہوئی تھیں کہ اُن کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں نے اُن پر عمل کیا، اور واقعی اِن کی وجہ سے میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میں لکھتا جاتا تھا، خود اعتمادی پیدا ہوتی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے اندر میرے تحقیقی مقالے کے کئی باب تیار ہو گئے۔ میں نے یہ باب نیاز صاحب کو بھی دکھائے، اور انہوں نے ان کی تعریف کی۔ اس تعریف نے کچھ اور بھی ہمت بندھائی اور میں نے چند مہینے میں تمام باب مکمل کر لیے۔

اب نیاز صاحب سے میری ملاقاتیں کچھ زیادہ ہی ہونے لگیں۔ میں اکثر شام کو اُن کے ہاں چلا جاتا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مصروف آدمی ہیں۔ اُن سے استفادہ کرتا تھا۔ نیاز صاحب مجھے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے اور اُن کی گل افشانیٔ گفتار کا عالم کسی طرح اُن کی تحریروں کی شگفتگی اور شادابی سے کم نہیں ہوتا تھا۔

ان باتوں میں کبھی ہندوستان کی سیاست زیرِ بحث آتی تھی، کبھی تہذیبی اور ثقافتی معاملات کا بیان ہوتا تھا۔ کبھی انسانی نفسیات کے عجیب و غریب پہلو اُجاگر کیے جاتے تھے، کبھی شعر و ادب کے اسرار و رموز کا تذکرہ ہوتا تھا، اور کبھی نیاز صاحب اپنے ذاتی تجربات کو مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

اور میں اُن کی اِن دلچسپ باتوں کو خاموشی سے سُنا کرتا تھا۔

ایک دن نیاز صاحب غزل پر باتیں کرنے لگے، اور اس صنف کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں روشنی ڈالنے کے بعد مجھ سے پوچھنے لگے۔

"آپ کو غزل سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"

میں نے جواب دیا "غزل گو شعرا کو میں شوق سے پڑھتا ہوں، غزل کو ایک اہم صنف سمجھتا ہوں۔ اور اس سے لُطف اندوز ہوتا ہوں۔

کہنے لگے "بس میں یہی جاننا چاہتا تھا۔ اب آپ 'نگار' کے لیے غزل کی اہمیت" کے موضوع پر ایک مضمون لکھ دیجیے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔"

چنانچہ میں نے غزل کے فنّی اور جمالیاتی پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا، اور قدیم اور جدید غزل گو شعراء کا مطالعہ کر کے جدید تنقید اور جمالیات کی روشنی میں "غزل کی اہمیت" پر ایک طویل مضمون تیار کیا، اور نیاز صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

نیاز صاحب نے مضمون لے کر رکھ لیا اور کہا "اطمینان سے پڑھوں گا۔"

دوسرے دن میں نیاز صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے مضمون کی تعریف کی، اور کہا کہ یہ جدید اصول تنقید اور جمالیات کی روشنی میں لکھا گیا ہے، اور اس سے صنف غزل کے بارے میں بیشتر غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ میں اس کو "نگار" میں شائع کروں گا۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب "نگار" ہی میں پروفیسر کلیم الدین احمد غزل پر اپنا مضمون لکھ کر شائع کروا چکے تھے، اور انہوں نے اس مضمون میں صنف غزل کو نیم وحشی صنفِ ادب ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس چونکا دینے والے مضمون کا اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا، اور صنف غزل سے دلچسپی لینے والے یہ چاہتے تھے کہ اس موضوع پر جدید تنقید کے اصولوں کی روشنی میں وقتاً فوقتاً مضامین لکھے جائیں۔ فراق صاحب اور مجنوں صاحب نے بھی غزل پر اُس زمانے میں لکھا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب پہلے ہی اس موضوع پر لکھ چکے تھے۔ اور انہوں نے اپنی کتاب "ہماری شاعری" میں اس صنف کی وکالت کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب نیاز صاحب کی فرمائش پر میں نے بھی غزل کی حمایت میں یہ مضمون لکھا۔

یہ مضمون "غزل کی اہمیت" نگار میں شائع ہوا۔ غزل کے پرستاروں نے اس کو پسند کیا۔ حتیٰ کہ جوش صاحب تک نے غزل کے مخالف ہونے کے باوجود، اس کے بارے میں اچھے الفاظ کہے جو میری ہمت افزائی کا باعث بنے۔

اور پھر میں نے نیاز صاحب ہی کی ہمت افزائی کے باعث صنف غزل کے مختلف پہلوؤں پر کئی مضامین لکھے جو بالآخر غزل پر میری ضخیم کتاب "غزل اور مطالعۂ غزل" کی تالیف و ترتیب کا باعث بنے قیام پاکستان کے بعد یہ کتاب انجمن ترقی اُردو پاکستان نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر ایک تنقیدی نوٹ لکھ کر میری ہمت بڑھائی، اور اس میں بعض ایسے جملے بھی لکھے جن کو میں اپنا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

مولوی صاحب مرحوم نے تحریر فرمایا۔

"حالی کے بعد کچھ دنوں غزل پر بہت لے دے رہی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعض فرسودہ رسم و رواج کی طرح یہ صنفِ کلام متروک ہو جائے گی۔ لیکن یہ ہماری تہذیب، ہماری روایات، ہمارے خیالات و تصورات میں ایسی رچی ہوئی تھی، کہ اس کا ترک کرنا ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ حالی اصلاح چاہتے تھے۔ انہوں نے اس میں وسعت پیدا کی۔ پھر اس کی وسعت کا دائرہ بڑھتا ہی گیا۔ اس نے وقت کے تقاضوں اور ماحول کے اثرات کو اپنے میں ایسا جذب کیا کہ اُس کے حسن و جمال میں ایسی دلکشی اور رعنائی پیدا ہو گئی کہ وہ تمام اصنافِ سخن پر چھا گئی۔ اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عالم و عامی، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، سب اُس کے شیدائی ہیں۔ یہ بہت نازک صنف ہے۔ اس کی اپنی زبان ہے، اور حُسن بیان اس کی جان ہے۔

اس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت نے غزل کے ارتقاء، اس کی اہمیت، اُس کے جمالیاتی پہلو، جدید رجحانات اور اُس کے مستقبل، غرض اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور بصیرت افروز بحث کی ہے، اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں ہیں اور چند غزل کے ارتقاء پر۔ غزل پر ایسی جامع کتاب، جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہو، اب تک نہیں لکھی گئی۔

ڈاکٹر عبادت صاحب اُردو کے ممتاز نقادوں میں ہیں، اور اُن کا انداز تنقید امتیازی حیثیت رکھتا ہے"۔۔۔ عبدالحق

اور بڑی بات یہ ہے کہ اس عبارت کو انھوں نے کتاب کے فلیپ پر عکس کی صورت میں شائع کیا۔

یہ عزت افزائی جو میرے نصیب میں آئی اس کا سہرا نیاز صاحب ہی کے سر ہے۔ کیونکہ اگر وہ میری ہمت افزائی نہ کرتے تو شاید میں غزل کی صنف پر یہ تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوتا۔

کم و بیش اسی زمانے میں نیاز صاحب کو "نگار" کا جدید شاعری نمبر مرتب کر کے شائع کرنے کا خیال آیا۔ کیونکہ اس زمانے میں جدید شاعری کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ خالد، راشد اور میراجی کی آزاد نظمیں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو رہی تھیں۔ آزاد نظم ادبی اور تنقیدی حلقوں میں موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی۔ بہت سے بزرگوں نے اس کو ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب اس کے خلاف ایک طویل مضمون رسالۂ ساقی میں لکھ چکے تھے۔ مولانا حامد حسن قادری نے بھی جدید شاعری اور خصوصاً آزاد نظم پر نہایت جارحانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ مولانا اختر علی تلہری بھی اس کے خلاف اکثر مختلف رسائل میں لکھتے رہتے تھے۔ غرض بزرگوں کی طرف سے آزاد نظم کے خلاف ایک اچھا خاصا محاذ بنا ہوا تھا۔

نیاز صاحب بھی آزاد نظم کے خلاف تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ نگار کے جدید شاعری نمبر میں اس موضوع پر ایک مفصل مضمون شائع کیا جائے۔ اس کام کے لیے انہوں نے اس حقیر فقیر کا انتخاب کیا۔ غالباً انہیں یہ خیال تھا کہ میں چونکہ غزل کی حمایت میں مضمون لکھ چکا ہوں، اور اُس کو ایک اہم صنف خیال کرتا ہوں۔ اس لیے آزاد نظم کی مخالفت میں لکھوں گا، اور اس طرح اُس کے بخیے بکھر جائیں گے۔

میں نے اُن کے اس ارادے کو بھانپ لیا، اور جب انہوں نے مجھ سے نگار کے سالنامے کے لیے آزاد نظم پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو میں فوراً تیار ہوا، اور کوئی ڈیڑھ

دو مہینے کی محنت کے بعد آزاد نظم پر فل سکیپ سائز کے کوئی ساٹھ ستر صفحے کا مضمون تیار کیا۔ اس مضمون میں میں نے آزاد نظم کی عروضی حیثیت، دنیا میں آزاد نظم کی مقبولیت، اُردو شاعری میں اس کی روایت، اور انگریزی اور اُردو کی آزاد شاعری کا جائزہ لیا، اور خاصی تجزیاتی بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ آزاد نظم کی صنف سخن زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ ہے اور اسی لیے اُس کو نہ صرف اُردو بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

یہ طویل مضمون جب میں نے نیاز صاحب کو دیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ احتیاط سے اس کو اپنے پاس رکھ لیا، اور کہا کہ مضمون طویل ہے، اس لیے اطمینان سے پڑھوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس مضمون پر میں نے جو محنت کی ہے، اُس کو تو یقیناً نیاز صاحب سراہیں گے لیکن جو نتائج میں نے نکالے ہیں، اُن سے انہیں اتفاق نہیں ہو گا۔

چنانچہ یہی ہوا۔

کئی دن کے بعد نیاز صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "آپ کا مضمون تو بہت اچھا ہے۔ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ لیکن طویل بہت ہے۔ نگار میں پورا مضمون نہیں چھپ سکتا، اگر آپ اجازت دیں تو اس کو ذرا مختصر کر کے شائع کر دوں"۔

میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے جس طرح جی چاہے چھاپ دیجیے۔ اشاعت کے بعد اس کا مسودہ مجھے واپس کر دیجیے گا"۔

چنانچہ 'نگار' کے جدید شاعری نمبر میں میرا یہ مضمون شائع تو ہوا۔ لیکن جب میں نے اس کو پڑھا تو مجھے اس کا حلیہ بگڑا ہوا نظر آیا۔ نیاز صاحب نے اس مضمون میں خاصی کاٹ چھانٹ کر دی تھی، اور صرف نصف کے قریب مضمون شائع کیا تھا۔ اس کاٹ چھانٹ کی وجہ سے مضمون غیر مربوط ہو گیا تھا اور اس میں روانی باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن نیاز صاحب نے میرے خیالات کو باقی رکھا تھا اور جو نتائج میں نے نکالے

تھے، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ پھر بھی مجموعی طور پر مضمون کا وہ تاثر باقی نہیں رہا تھا، جس کو میں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے دبی زبان سے نیاز صاحب سے اس کی شکایت بھی کی، اور انہوں نے بھی اس کو محسوس کیا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ مضمون کو اس طرح شائع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

نیاز صاحب بڑے آدمی تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا کوئی دوسرا ہوتا تو اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرتا اور اپنی جگہ پر اڑا رہتا۔

بعد میں یہ مضمون ترمیم اور اضافے کے ساتھ میری کتاب "جدید شاعری" میں شائع ہوا۔

نیاز صاحب چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے تھے، اُن کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے اور ہمت بڑھاتے تھے۔

۱۹۵۱ء میں انہوں نے مولانا حسرت موہانی کے انتقال کے بعد سب سے پہلے 'نگار' کا حسرت نمبر نکالا۔ اس کے لیے انہوں نے مجھ سے بار بار مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ اور جب انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ "آئندہ سالنامہ حسرت نمبر ہو گا۔ اور میں اپنی تمام مساعی کو ناکام سمجھوں گا اگر آپ کا مقالہ نہ حاصل کر سکا۔ وسط اکتوبر سے کتابت شروع ہو جائے گی۔ فرمائیے کب تک توقع کروں"۔ اس طرح ان کے پیہم اصرار پر میں نے مولانا حسرت کے تغزل پر ایک طویل مضمون لکھ دیا۔ مولانا حسرت کی ذاتِ گرامی سے مجھے جو عقیدت اور محبت تھی اور ان کی شگفتہ و شاداب شاعری سے مجھے جو رغبت تھی، اُس کے پیشِ نظر میں نے یہ مضمون بڑے شوق سے لکھا، اور شاید مولانا حسرت کے جمالِ ہم نشیں کا یہ اثر تھا کہ اس مضمون میں بھی کچھ شگفتگی اور شادابی سی پیدا ہو گئی۔ نیاز صاحب نے اس مضمون کو بہت پسند کیا، اور مضمون کی رسید کی جو اطلاع بھیجی اُس میں یہ جملہ بھی لکھ دیا کہ "آپ نے جس محنت اور کاوش سے یہ مقالہ

مرتب کیا ہے اُس کی صحیح داد تو حسرت کی روح ہی دے سکتی ہے"۔

اس طرح نیاز صاحب میرے دل میں لکھنے کا حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتے رہے۔ اور میں لکھتا رہا۔ یہ ان کی شفقت اور محبت تھی۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

اس کے علاوہ اُس زمانے میں جب بھی میری کوئی کتاب شائع ہوتی تو اس پر نیاز صاحب نے خود بڑی محبت سے اچھا تبصرہ کیا بلکہ بعض کتابیں جو اُن کی دلچسپی کی تھیں، اُن کے لیے ناشروں کی فرمائش پر فلیپ کے لیے عبادتیں بھی تحریر فرمائیں۔ مثلاً مومن سے انہیں خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس لیے کوئی بیس پچیس سال قبل جب میری کتاب "مومن اور مطالعۂ مومن" شائع ہوئی تو نیاز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے فلیپ کے لیے یہ چند جملے تحریر فرمائے۔

"ڈاکٹر عبادت بریلوی ہمارے نقادوں کی صف میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے نقادوں کی طرح تنقید کو صرف فرضِ کفایہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو 'عبادت'، جان کر پورا خشوع و خضوع اس پر صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن مومن پر اُن کی ریسرچ اس سے زیادہ بلند چیز ہے —— اس قدر بلند کہ اگر آج مومن زندہ ہوتا تو وہ بھی اُن کی 'ولایت نقد' پر ایمان لے آتا۔ عین وہی منزل جسے ؏

شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد

کہتے ہیں"۔

نیاز صاحب کے یہ جملے میں نے خود ستائی کے خیال سے یہاں نقل نہیں کیے ہیں۔ ان کو نقل کرنے کا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نیاز صاحب بڑی محبت کے آدمی تھے۔ نوجوان لکھنے والوں پر ان کی شفقت اور محبت بے پایاں تھی۔ وہ ہمت بڑھاتے تھے اور اگر کوئی تحریر انہیں پسند آ جاتی تو وہ اس کی کھل کر داد دیتے تھے۔

اور یہ باتیں اُن کے دل سے نکلتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کی اس قسم کی تحریروں میں وہ شگفتگی اور شادابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اُن کی تحریروں کا نمایاں ترین وصف تھا۔

اس حقیقت سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے کہ نیاز صاحب ایک بہت بڑے عالم، بہت بڑے صحافی بہت بڑے ادیب اور انشاء پرداز، بہت بڑے افسانہ نگار، اور ادبیات کے بہت بڑے نقاد تھے۔ ان کے علم کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ، منطق، مابعد الطبیعات، الٰہیات، نفسیات، عمرانیات، غرض ہر علم پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور علمی معاملات و مسائل پر وہ غور و فکر کرنے کے بھی عادی تھے۔ علمی مسائل میں نئے نئے پہلو پیدا کرنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر پچاس ساٹھ سال میں ہزار ہا صفحات لکھے اور اپنی ان تحریروں سے انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے کا، ایک انسانی، عقلی، اور تجزیاتی زاویۂ نظر پیدا کیا ———

اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے لکھنے والوں میں وہ منفرد نظر آتے ہیں اور اس میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

نیاز صاحب بڑی بھر پور شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے فتح پور ہسوہ کے ایک پٹھان خاندان میں آنکھ کھولی۔ ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی۔ انہیں بچپن ہی سے سخت قسم کا مذہبی ماحول ملا۔ چنانچہ مذہبی معاملات سے انہیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ فتح پور کے اسلامی اور دینی مدرسوں میں داخل کیے گئے، درس نظامی کی تکمیل کی۔ لیکن بعض اساتذہ کی قدامت پسندی اور خشونت نے اُن پر منفی اثرات بھی کیے، اور اس طرح عقلیت پسندی اُن کے مزاج کا جزبن گئی۔

نیاز صاحب کے والد پولیس میں ملازم تھے۔ اس لیے وہ یوپی کے مختلف شہروں میں رہے، اور وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے انہیں مواقع ملے ——— خاص

طور پر لکھنؤ کے اس دور کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا جو واجد علی شاہ کے بعد انحطاط وزوال کی طرف تیزی سے گامزن تھا لیکن جہاں تہذیب و شائستگی اپنے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ یہ زمانہ نیاز صاحب کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اُن کے والد لکھنؤ میں کوتوال تھے۔ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لکھنوی تہذیب کے ساتھ مطابقت پیدا کی۔ صنف لطیف نے اس تہذیب میں جو رنگ بھرے تھے، اُن سے اپنے ذوقِ جمال اور حسِ لطیف کی تسکین کا سامان پیدا کیا اور یہ رنگینی اور رعنائی اُن کے حواس پر اس طرح چھائی کہ اُس نے ساری زندگی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اس زمانے کے واقعات نیاز صاحب کبھی کبھی مزے لے لے کر بیان کرنے لگتے تھے، اور ہمارے ایسے لوگ چپ چاپ ان واقعات کو سُنا کرتے تھے اور دل ہی دل میں یہ کہتے سنتے کہ نیاز صاحب، آپ کی یہ دلچسپی صحت مندانہ حدود میں تھی، اور اس دلچسپی نے بعض ایسی تحریروں کی تخلیق کی ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی مثلاً ایسی ایسی تحریریں "راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بیندی، اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا چیز ہیں"۔ میں عالم محویت میں نیاز صاحب کی یہ باتیں سُنتا تھا، اور اس قسم کی متعدد تحریریں میرے ذہن کے افق پر منڈلاتی رہتی تھیں۔

نیاز صاحب کی ایسی باتیں سُن کر اور ان کی اِن حسین و جمیل تحریروں کو یاد کر کے اُن سے بہت سے سوال کرنے کو جی چاہتا تھا، لیکن ان کی بزرگی، اور خورد ہونے کی وجہ سے میری کم مائیگی، درمیان میں حائل ہو جاتی تھی، اور میرا راستہ روک لیتی تھی۔ اس لیے بس میں اُن کی یہ دلچسپ اور رنگین باتیں سُنا کرتا تھا، اور اُن سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک ایسے رنگین اور رومانی مزاج شخص کو سب انسپکٹر کی حیثیت سے پولیس کی ملازمت کرنی پڑی۔ ان کے والد لکھنؤ میں کوتوال تھے۔ انہوں نے

نیاز صاحب کو پولیس انسپکٹر نامزد کردا دیا، اور اس طرح لکھنؤ انہیں چھوڑنا پڑا۔ لیکن دو سال سے زیادہ وہ اس ملازمت میں نہ گذار سکے۔ چنانچہ استعفےٰ دے دیا، اور پھر صحافت اور ادب کی طرف متوجہ ہوئے مختلف ملازمتیں بھی کیں لیکن بنیادی طور پر وہ ادیب تھے۔ اسی لیے اسی "فن بے اعتبار" کی طرف پوری طرح توجہ کی، اور زندگی اسی کوچے کی رہ توردی میں گذار دی۔ زمیندار، الہلال، توحید، خطیب، اور رعیت سے بہ حیثیت صحافی وابستہ رہے۔ اور پھر "نگار" نکالا جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۲ء تک ان کی ادارت میں جاری رہا۔ اور ان کے شاگرد دوست ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں اب بھی جاری ہے۔

'نگار' میں انہوں نے ہزارہا صفحات مختلف موضوعات پر لکھے۔ ان کی تحریریں اُن کی علمیت اور تجزیاتی مزاج کا آئینہ ہیں۔ نیاز صاحب نے اپنا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گذارا، ان کا مُطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُن کی نگارشات ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان میں ایسی جذب و کشش ہے کہ وہ دلوں میں اترتی حواس پر چھاتی ہیں اور غور و فکر کے لیے خاصا سامان فراہم کرتی ہیں۔ وہ ایک بڑے مفکر، صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز، اور ایک بلند پایہ مفکر تھے۔ زندگی اور زمانے کی مزاج دانی کا شعور اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ہندوستان کی حکومت نے ان کی اس بڑائی کا اعتراف انہیں اپنا سب سے بڑا اعزاز 'پدم بھوشن' دے کر کیا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے فوراً بعد انہیں پاکستان آنا پڑا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ان کے نجی حالات پر تھی۔ انسان بھی کتنا مجبور ہے۔ وقت اور زمانہ انسان کا سب سے بڑا قاتل ہے۔ جو انسان کو اپاہج اور بے بس بنا دیتا ہے، اور اس کے حوصلوں اور ولولوں کو خاک میں ملا کر ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ نیاز صاحب ہمیشہ جواں رہے اور ان کی زندگی میں حوصلوں اور ولولوں کا ایک سمندر موجیں مارتا رہا۔ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے لیکن آخر عمر میں، ایک مہلک مرض نے انہیں آلیا، جس کے نتیجے

میں انہیں ہجرت کرنی پڑی، اور اپنے بچوں کے پاس کراچی میں قیام کرنا پڑا۔

میں لندن جانے سے قبل جولائی ۱۹۶۲ء میں اس خیال سے لکھنؤ گیا کہ پانچ سال دیار غیر میں گذارنے ہیں، احباب سے مل لوں، بزرگوں کو دیکھ لوں اور در و دیوار کو سلام کر لوں اپنے اساتذہ سے ملا، عزیزوں اور رشتے داروں سے ملاقات کی، دوستوں کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کیں، سڑکوں بازاروں اور عمارتوں کو دیکھا، اور نیاز صاحب سے بھی ملنے گیا۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھے تھے، جہاں ہمیشہ اُن کا کاتب بیٹھا ہوا کتابت کے کام میں مصروف نظر آتا تھا۔ اور جہاں برسوں پہلے وہ میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے اور اپنی گل افشانی گفتار سے گل و گلزار کھلاتے تھے۔

نیاز صاحب کا رنگ زرد ہو گیا تھا، اور وہ مجھے بہت زیادہ کمزور اور ضعیف نظر آ رہے تھے۔ انہیں اس عالم میں دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے سلام کیا، مزاج پوچھا۔ اور اپنے لکھنؤ آنے کا مقصد بیان کیا۔ نیاز صاحب آہستہ سے بولے "اچھا ہوا، آپ آ گئے۔ اس مکان میں آخری ملاقات آپ سے ہو گئی، میں کراچی جا رہا ہوں، مجبور ہوں —— میرے لیے دعا کیجیے۔"

میں سکتے میں آ گیا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُن کے چہرے کی کیفیت سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہیں، اور اندر سے بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ اُن کا گھر اور دفتر جہاں کبھی زندگی ہی زندگی نظر آتی تھی، اب اجڑے ہوئے دیار، اور لٹی ہوئی بستی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سامان چاروں طرف بکھرا ہوا تھا، اور اس گھر پر ایک عجیب طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ نیاز صاحب پاکستان آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر اُن سے باتیں کیں، ان کا دل بڑھایا، اور کہا کہ پاکستان میں آپ کو آرام ملے گا اور آپ انشاءاللہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ لیکن اُداسی کے عالم میں وہاں سے واپس آیا۔"

لاہور واپس آکر میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے پانچ سال کے لیے لندن چلا گیا۔ میری عدم موجودگی میں نیاز صاحب کا چند سطروں کا خط لاہور پہنچا جس میں لکھا تھا۔

"میں ۱۸ جولائی کو لاہور پہنچ رہا ہوں، اور اسی دن غالباً کراچی چلا جاؤں گا۔ زحمت نہ ہو تو اسٹیشن پر مل لیجئے"——

لیکن میں تو اُس وقت ہزاروں میل دور، سات سمندر پار دیارِ غیر میں جاچکا تھا۔ اُن سے لاہور اسٹیشن پر کس طرح ملتا۔ لندن میں اُن کا یہ خط بھی ملا، اور احباب کے خطوں سے اُن کے کراچی آنے اور علالت کے عالم میں زندگی کے آخری ایام گذارنے اور پھر اس دنیا سے رخصت ہونے کی تفصیل معلوم ہوئی۔ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اور عرصہ دراز تک نیاز صاحب کی رنگا رنگ شخصیت میرے ذہن پر چھائی رہی۔

نیاز صاحب بڑی بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی محنت اور جدوجہد سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کو علم و ادب کے لیے وقف کیا، اور اپنی تحریروں سے علم و ادب میں گراں قدر اضافے کیے۔ اور انشاء پردازی کا ایک ایسا منفرد انداز پیدا کیا جو انہیں پر ختم ہو گیا۔ ان کی تحریروں کی شگفتگی اور شادابی برسوں تک ان کی یاد کو تازہ اور شگفتہ و شاداب رکھے گی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے علم و ادب کا ایک ماحول پیدا کیا۔ نوجوان لکھنے والوں کی تربیت کی، اور ان کی ہمت افزائی کر کے ادیبوں اور دانشوروں کی، لکھنے والوں کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی جو آج بھی اُردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔

اور جن کی بدولت نیاز صاحب کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

پروفیسر حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات دِلّی میں ہوئی۔ غالباً ۲۵ء کی بات ہے کہ ہم نے اینگلو عربک کالج دہلی میں بڑے پیمانے پر یومِ غالب منانے کا پروگرام بنایا۔ میری خواہش یہ تھی کہ یوم غالب کا یہ جلسہ عربک کالج کی علمی و ادبی روایت کے شایانِ شان ہو۔ چنانچہ میں نے اس بات کی کوشش کی کہ غالب کے تمام اہم محققوں اور نقّادوں کو اس موقع پر جمع کیا جائے۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا شمار اس وقت بھی غالب کے اہم محققوں اور نقادوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے غالب کی زندگی پر مختلف ادبی رسائل میں ایسے مقالات لکھے تھے اور اُن کے فکر و فن کا ایسا تجزیہ اپنے بعض مضامین میں کیا تھا۔ کہ وہ غالب شناسوں کی صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے تھے۔

میں نے یہ سوچا کہ خاں صاحب سے اس جلسے میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ حمید احمد خاں صاحب دِلّی میں موجود ہیں اور پالی ٹکنیک میں انگریزی زبان و ادب کے اُستاد ہیں۔ میں مِلنے جلنے سے ذرا گھبراتا ہوں۔ خاں صاحب

سے ملنے کی تو ہمت نہیں پڑی۔ اس لیے میں نے انہیں یوم غالب کے بارے میں خط لکھ دیا اور یہ درخواست کی وہ جلسے میں شرکت فرمائیں اور اپنے گراں قدر مقالے سے ہم سب کو نوازیں۔

یہ خط لکھ کر میں اُن کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ کئی دن گذر گئے لیکن جواب نہیں آیا۔ پھر بھی میں مایوس نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے سُن رکھا تھا کہ خاں صاحب خطوں کے جواب پابندی سے لکھتے ہیں اور نوجوانوں کی بہت ہمت افزائی کرتے ہیں۔

ایک دن میں یہ سوچ رہا تھا کہ خط کا جواب تو آیا نہیں۔ اس لیے مجھے خود اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر یوم غالب کے جلسے میں شریک ہونے کی درخواست کرنی چاہیئے کہ خاں صاحب بہ نفس نفیس کالج میں تشریف لے آئے۔ میں نے اس سے قبل انہیں نہیں دیکھا تھا، صرف اُن کے عالمانہ مقالات پڑھے تھے، اور میرے ذہن میں اُن کی تصویر یہ تھی کہ بہت بھاری بھر کم قدوقامت کے انسان ہوں گے۔ لیکن جب انہیں دیکھا تو اس کے بالکل ہی برعکس پایا۔ چھوٹا قد، دُبلا پتلا جسم لیکن زندگی سے بھرپور یوں محسوس ہوا جیسے اس مختصر سے جسم میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ انداز گفتگو میں نرمی ہے لیکن آواز میں تلوار کی سی تیزی ہے۔

مُلاقات ہوئی تو میں نے اپنے حاضر نہ ہونے کی معذرت کی اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ لیکن خاں صاحب نے فرمایا کہ "میں تو آپ کو اس بات کی مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ بڑے پیمانے پر غالب کی برسی منا رہے ہیں۔ غالب مسلمانوں کی تہذیب کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ اس لیے اس کی یاد میں جلسہ کرنا مسلم تہذیب اور معاشرے کی خدمت ہے"

اور اِس طرح خاں صاحب دیر تک اسلامیانِ ہند کی تہذیب، اُردو زبان، اردو شاعری، مغلوں کے دورِ آخر کے معاشرتی تہذیبی اور فکری رجحانات اور غالب کی اہمیت

پر باتیں کرتے رہے۔ اور یہ وعدہ فرمایا کہ وہ ضرور غالب کی شخصیت اور شاعری کے کسی پہلو پر مقالہ پڑھیں گے۔ کوئی ایک گھنٹہ خاں صاحب نے عربک کالج میں ہمارے ساتھ گذارا، اور پھر یہ کہہ کر رخصت ہونے کہ انشاء اللہ ۱۶ فروری کو یوم غالب میں ملاقات ہوگی۔

پروگرام کے مطابق اسی تاریخ کو یوم غالب منایا گیا۔ اس جلسے میں حمید احمد خاں صاحب نے اپنا وہ گراں قدر مقالہ پڑھا جو غالب کی نجی زندگی کے بارے میں تھا، اور جس کو مرتب کرنے کے لیے وہ دِلّی کے گھروں میں جا کر ایسی بڑی بوڑھیوں سے بھی ملتے تھے۔ جنہوں نے اپنے بچپن میں غالب کو دیکھا تھا۔ اِسی معلومات کو بنیاد بنا کر خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں غالب کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالی تو حاضرین جلسہ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کی تصویر الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی۔

حمید احمد خاں صاحب کے مقالے کی ساری دِلّی میں دھوم مچ گئی، اور اس مقالے کی وجہ سے ہمارا یومِ غالب توقع سے کچھ زیادہ ہی کامیاب رہا۔

اُس زمانے میں اردو کی مشہور ادیبہ اور ناول نگار خاتون حمیدہ سُلطانہ صاحبہ کا قیام کشمیری دروازے کے باہر سری رام روڈ پر تھا جہاں وہ اکثر ادیبوں کو جمع کرتی تھیں۔ کھانے کا اہتمام ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹے تک ادب و شعر کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

حمیدہ سلطان صاحبہ کا سلسلۂ نسب غالب سے مِلتا ہے اور اس اعتبار سے انہیں بھی غالب سے گہری دلچسپی تھی۔ یوم غالب کے بعد ایک شام انہوں نے اپنے سری رام روڈ والے مکان میں اہم ادیبوں کو مدعو کیا اور کھانے کی دعوت کی۔ اس موقع پر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ساتھ تاثیر صاحب، حفیظ صاحب، فیض صاحب، راشد صاحب، شاہد احمد دہلوی صاحب، پروفیسر وقار عظیم صاحب، اور ان کے علاوہ بہت سے ادیب موجود تھے۔

مجھے بھی اِس محفل میں پہلی بار اِن ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ شریک ہونے

کا موقع ملا۔ بڑی دلچسپ محفل تھی اس صحبت کو میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔

اس محفل میں بے شمار موضوعات پر نہایت دلچسپ باتیں ہوئیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ، معلومات افزا، اور دل میں اُتر جانے والی باتیں حمید احمدؔ خاں صاحب کی تھیں ـــــ خصوصیت کے ساتھ وہ باتیں جن میں غالب پر اُن کی تحقیق کی تفصیل تھی۔ اور میں اُن کی اِن باتوں کو نہایت خاموشی سے سُنتا رہا تھا۔

قیام پاکستان سے قبل دلی کے دورانِ قیام میں حمید احمدؔ خاں صاحب کی خدمت میں اکثر مجھے حاضر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ اور جیسے جیسے مجھے اُن کی عظیم شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ اُن کی یہ عظیم شخصیت، انسانیت اور انسان دوستی، تہذیب اور شرافت، شفقت اور محبت کا مجسمہ ہے اور یہ کہ ادب اور فن سے دلچسپی، ان تھک کام کرنے کی لگن، زندگی کو بہتر بنانے کی دُھن سے عبارت ہے۔

لیکن پھر ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء میں اسلامیان ہند پر جو قیامت ٹوٹی، اُس نے دلیؔ کی ان محفلوں کو درہم برہم کر دیا۔ خاں صاحب دلیؔ سے واپس آکر اسلامیہ کالج لاہور میں پھر انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہو گئے۔ میں اورینٹل کالج لاہور میں اُستاد کی حیثیت سے منسلک ہو گیا۔ اس طرح قیام پاکستان کے بعد بھی لاہور میں مجھے حمید احمد خاں صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور اُن سے استفادہ کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

اس زمانے میں خاں صاحب میرے مُربیؔ، ہمدرد اور دَم ساز تھے۔ کوئی پریشانی ہوتی۔ کسی قسم کا مسئلہ پیش آجاتا تو میں اُن کو سُلجھانے کے لیے اسلامیہ کالج کا رُخ کرتا یا خاں صاحب کی جائے قیام ۵۔ بیگم روڈ پہنچ جاتا۔ خاں صاحب ہماری باتوں کو غور سے سُنتے، ہدایات دیتے اور رہنمائی کرتے۔ اُن سے مل کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے ہر مرض کی دوا اُن کے پاس موجود ہے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ میں صرف

غم غلط کرنے کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن اُن کی باتوں میں اتنی شفقت اور محبت ہوتی تھی کہ اُن کی باتیں ہمارے زخموں کے لیے مرہم کا کام کرتی تھیں۔

میں اس زمانے میں جس ماحول میں کام کر رہا تھا، اُس میں شر بہت تھی۔ آئے دن ایذا رسانی اور مردم آزاری کے نئے نئے روپ انتہائی بھیانک صورتوں میں ہمارے سامنے آتے تھے۔ میں اس شر سے بچنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے خاں صاحب کی آغوش شفقت میں پناہ لیا کرتا تھا۔

اس دورِ پُرآشوب کے دو واقعے ایسے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ایک تو یہ کہ ابھی میں نے لاہور میں آکر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے بارے میں ایک بزرگ نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ ایم۔اے اور بی۔ایچ۔ڈی کی تدریس سے میرا کوئی تعلق نہیں، اور میں صرف ادیب فاضل کا اُستاد ہوں۔ یونیورسٹی نے مجھے آنرز بھیج کر سینئر لیکچرار کی حیثیت سے بلایا تھا۔ لیکن متعلقہ افسر صاحب نے واضح طور پر یہ فرمایا کہ مجھے ہفتے میں ۲۸ گھنٹے ادیب فاضل کو لیکچر دینے ہوں گے —— ہفتے میں ۲۸ گھنٹے — اس کے تصوّر سے آج بھی میری روح قبض ہونے لگتی ہے۔

جب میں نے اپنے لیے یہ سزا سُنی" تو مُلّا کی دوڑ مسجد، میں نے اسلامیہ کالج کا رُخ کیا۔ خاں صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ تفصیل اُنہیں سُنائی —— خاں صاحب فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔

کہنے لگے "یہ ایک سازش ہے۔ میں رحمٰن صاحب اور تاثیر صاحب سے بات کروں گا۔ آپ بھی ان سے ملیے انہیں صحیح حالات کا علم ہونا چاہیئے"۔

تاثیر صاحب سے تو میرے تعلقات تھے لیکن رحمٰن صاحب سے میری ملاقات نہیں تھی —— میں نے ڈرتے ڈرتے خاں صاحب سے یہ بات کہی کہ میں تاثیر صاحب

سے تو مِل لوں گا لیکن رحمٰن صاحب سے میری کوئی شناسائی نہیں"۔

خاں صاحب فرمانے لگے "آپ اُن سے مِل کر خوش ہوں گے۔ نہایت شریف نیک ہمدرد اور معاملہ فہم انسان ہیں۔ میں بھی ان سے بات کرلوں گا لیکن صحیح حالات آپ ہی اُن تک پہنچائیں تو اچھا ہے ـــــ کیونکہ وہ آپ کے وائس چانسلر ہیں"۔

میں نے خاں صاحب کے نسخے کو استعمال کیا۔ تاثیر صاحب تو بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی مزاح کا پہلو ضرور ہوتا تھا۔ پہلے تو انہوں نے اس واقعے سے خوب لطف لیا اور پھر کہنے لگے "یار تو فکر نہ کر۔ میں بھی رحمٰن صاحب سے بات کردوں گا"۔

رحمٰن صاحب سے ملنے کے لیے میں نے وقت لیا۔ فوراً جواب آیا کہ ۴ بجے شام کو گھر پر ملیئے"ـــــ میں ۳۸ لارنس روڈ پہنچا۔ رحمٰن صاحب بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے مِلے۔ ساری روداد سُنی، اور سُن کر فرمایا کہ "میں خود متعلقہ شخص سے بات کروں گا۔ یہ رویّہ غلط ہے۔ آپ کو اس یونیورسٹی نے خاص طور پر بلایا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوگا۔ آپ ایک درخواست ضرور دے دیجیئے جس میں ان حالات کی تفصیل ہو۔

میں نے درخواست پیش کر دی۔ رحمٰن صاحب نے احکامات صادر فرما دیئے۔ شر کا خاتمہ ہوگیا اور میں نے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا۔

یہ سب کچھ حمید احمد خاں صاحب کی شفقت اور محبت کا ایک کرشمہ تھا۔ ورنہ شاید میرے ذہن میں کبھی بھی رحمٰن صاحب سے ملنے کا خیال بھی نہ آتا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ میرے ساتھ اورینٹل کالج میں ایک صاحب اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اُردو میں فرسٹ کلاس ایم۔اے اور بی۔اے آنرز تھے۔ مجھ سے قبل اورینٹل کالج میں آچکے تھے۔ باقاعدہ تقرر ہوچکا تھا لیکن تین سال

تک کام کرنے کے باوجود مستقل نہیں ہوسکے تھے۔ بے چارے نے بڑی منت خوشامد کی لیکن ہمیشہ گول مول جواب ملا۔ بالآخر انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ انہیں فریب دیا جارہا ہے۔ اورینٹیل کالج سے ان کے نکالنے کے منصوبے بنائے جاچکے ہیں اور انہیں عملی جامہ بھی پہنادیا گیاہے۔

وہ گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور یہ خبر وحشت اثر سُنائی۔

میں نے کہا" چلئے خاں صاحب کی طرف"۔

شام کو بیگم روڈ پہنچے۔ اطلاع کرائی۔ خاں صاحب فوراً باہر تشریف لے آئے۔ تفصیل سُنی۔ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور ایک غریب اور بے گناہ شخص کی مدد کرنے کے لیے چند منٹ میں اِس جنگ کا پورا نقشہ تیار کرلیا جو مختلف مقامات پر لڑی جانے والی تھی۔ خاں صاحب نے اس سلسلے میں کیا کیا کچھ کیا، کتنے لوگوں سے ملے۔ تاثیر صاحب سے کتنی دفعہ اس موضوع پر باتیں کیں اور کس طرح اس معاملے کو سنیٹ تک لے گئے۔ اس کی تفصیل کیا بیان کردں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ خاں صاحب نے اس زمانے میں اس بے گناہ شخص کی خاطر اپنے معمولات تک کی بازی لگادی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ خاں صاحب کو اس معاملے میں کامیابی نہ ہوسکی۔ بدقسمتی سے انہیں دنوں اچانک تاثیر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور اُن کے اُٹھ جانے سے ہم سب بے یار و مددگار رہ گئے۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں شاید یہ پہلا اور آخری واقعہ تھا کہ انتخاب ہو جانے کے باوجود تین چار سال تک ایک شخص کو کنفرم دستقل، نہیں کیا گیا۔ بلکہ بغیر کسی قصور کے ملازمت سے برطرف کرکے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔

اس کی وجہ کیا تھی ؟ اس کی تفصیل کا علم صرف علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب اور آغا بیدار بخت خاں صاحب کو تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے ایک بے گناہ شخص کی

روزی کو بچانے کی خاطر اس ظالم انسان کے پیروں پر ٹوپی تک رکھ دی تھی لیکن انہیں جواب یہ ملا تھا ——

"میں اس کو یہاں نہیں رہنے دوں گا —— کیونکہ میرا منصوبہ خاک میں مل جائے گا اس جواب میں لفظ کیونکہ کے بعد ایک فقرہ اور تھا جس کا علم بھی علامہ صاحب اور آقا صاحب ہی کو تھا۔

اس واقعے کے بعد اس بے گناہ شخص پر کیا گذری، اس کا علم جن تین چار بزرگوں اور دوستوں کو تھا، اُن میں سے ایک حمید احمد خاں صاحب بھی تھے۔

جب بھی انہیں اس واقعے کی یاد آتی —— (اور یہ یاد اکثر آتی تھی) تو اُن پر ایک کرب کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا اور وہ کہتے تھے "بڑا ظلم ہوا۔ افسوس میں کچھ نہ کر سکا۔"

حمید احمد خاں صاحب بڑے ہی باہمت، نڈر، بے باک اور مخلص بزرگ تھے۔ انتہائی ناساز گار حالات میں بھی اگر اُن کا کوئی جاننے والا یا دوست کسی پریشانی یا آفت ناگہانی میں مبتلا ہوتا تو وہ انجام کی پروا کیے بغیر شمشیر برہنہ بن کر میدان میں نکل آتے تھے۔

ان آنکھوں نے اسی شہر لاہور میں دیکھا ہے کہ ایک زمانے میں فیض صاحب کا نام سن کر لوگ گھبراتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب فیض صاحب پہلی دفعہ گرفتار کئے گئے تھے اور ایک نہایت ہی سنگین قسم کا مقدمہ ان پر چلایا گیا تھا۔ دلوں پر اس واقعے کا اثر تھا۔ لیکن کسی کو اس کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ سب کے سب سہمے ہوئے تھے۔ اس سکوت کو توڑنے میں سب سے پہلے جس شخص نے جرأت رندانہ سے کام لیا، وہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب تھے۔ اُنہوں نے ایک شام لاہور کے تقریباً تمام اہم لکھنے والوں کو اسلامیہ کالج میں جمع کیا، اور صلاح مشورے کے بعد فیض صاحب کی رہائی کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ادیبوں کے دستخطوں سے حکومت کو ایک درخواست پیش کی جائے جس میں فیض صاحب کی رہائی کا مطالبہ ہو۔ چنانچہ

دستخطوں کی مہم شروع ہوئی۔ سب سے پہلے حمید احمد خاں صاحب نے دستخط کیے۔ بعض لوگوں نے ڈر کی وجہ سے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور مجبوری یہ بتائی کہ وہ حکومت یا یونیورسٹی کے ملازم ہیں۔ ان میں دو حضرات تو ایسے تھے جو فیض صاحب کا دم بھرتے تھے اور اُن کو اپنا دوست بتاتے تھے۔ خاں صاحب کو اکثر غلط بات پر غصہ آجاتا تھا۔ لیکن اس واقعے پر جو برہمی میں نے ان کے مزاج میں دیکھی وہ کسی اور موقع پر نظر نہیں آئی۔

غرض خان صاحب نے ادیبوں کے دستخط کروا کے جو درخواست حکومت کو بھیجی، اور اس سلسلے میں مزید جو کوششیں کیں، وہ اُن کی جُرأت رندانہ، بے باکی، اخلاص اور محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اسلامیہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے حمید احمد خاں صاحب نے طلباء اور اساتذہ کی ایک کھیپ پیدا کی جس نے ادبی اور ثقافتی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اُن کی پرنسپلی کے زمانے میں کالج صرف تدریس کا ایک ادارہ ہی نہیں تھا، بلکہ ایک ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ یہاں مجلس یادگار غالب خاں صاحب کی رہنمائی میں غالب پر تحقیقی کام کے منصوبے بناتی تھی، قومی زبان اُردو کے بارے میں بڑے بڑے جلسے بھی اِسی کالج میں ہوتے تھے —— غالب پر پنجاب یونیورسٹی میں طباعت و اشاعت کا جو کام ہوا، اس کا ڈول برسوں پہلے اسلامیہ کالج ہی میں ڈالا گیا تھا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی زندگی کی آخری دردانگیز تقریر اسلامیہ کالج ہی میں کی تھی۔ خاں صاحب نے مولوی صاحب کو اس جلسے میں شرکت کرنے کے لئے خاص طور پر دعوت دی تھی —— اس تقریر میں انہوں نے پاکستان میں اُردو کی حالت، قومی زندگی میں اس کی اہمیت، انجمن ترقیٔ اُردو کی کیفیت پر ایسے جذباتی انداز میں باتیں کی تھیں کہ لوگوں

کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں نے اس موقع پر خان صاحب کو بھی آبدیدہ دیکھا اور انہوں نے جو تقریر کی اُس میں شروع سے آخر تک اُن پر رقّت طاری رہی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انجمن ترقیٔ اُردو میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مولوی صاحب اب انجمن سے دل برداشتہ تھے۔ کیونکہ آپس کے جھگڑوں اور سازشوں نے انجمن کو ایک اچھا خاصا اکھاڑہ بنا دیا تھا۔ مولوی صاحب پر اس صورت حال کا بہت اثر تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہر شخص اُن کا مخالف ہے اور اُن کے اور انجمن کے خلاف سازش کر رہا ہے۔

خاں صاحب کو ان تمام باتوں کا علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے مولوی صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ اسلامیہ کالج میں بہت بڑا جلسہ کیا اور نجی صحبتوں میں مولوی صاحب کے لیے دل کی بھڑاس نکالنے کا سامان پیدا کیا۔ اس کا اثر مولوی صاحب پر بہت اچھا ہوا، اور وہ یہ تاثر لے کر کراچی گئے کہ لاہور میں چھوٹے بڑے، خواص اور عوام سب اُن کے ساتھ ہیں اور اُردو کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں، اس میں یہ پورا شہر اُن کا ہم نوا ہے۔

حمید احمد خاں صاحب پروفیسر تو انگریزی کے تھے اور انگریزی زبان اور ادب پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت انگریزی لکھتے تھے۔ انگریزی ادب کے کسی پہلو پر بات چھڑ تو اس طرح بولتے تھے گویا ایک سمندر اُمڈنے لگا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُردو کے آدمی تھے۔ وہ اُردو کی تہذیبی اہمیت کو محسوس کرتے تھے۔ اُس کو انگریزی کی جگہ دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں کوئی قوم بغیر اپنی قومی زبان کے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سطح پر اُردو کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس دلچسپی نے انہیں اُردو کا سپاہی بنا دیا، اور وہ ساری زندگی اُردو کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو کو پاکستان کے

ہر دفتر میں رائج ہونا چاہیئے اور ہر پاکستانی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُردو میں کام کرے، اُردو لکھے، اُردو پڑھے اور اُردو بولے۔

چنانچہ جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو انہوں نے دفتری کام اُردو میں شروع کر دیا۔ ہوتا یہ تھا کہ جو فائلیں اُن کے پاس نیچے سے آتی تھیں اُن میں کلرک، اسسٹنٹ، سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ رجسٹرار، ڈپٹی رجسٹرار اور رجسٹرار انگریزی میں نوٹ لکھتے تھے۔ لیکن خاں صاحب اُن پر اُردو میں احکامات صادر فرماتے تھے، اور خاصی تفصیل سے اظہار خیال کرتے تھے۔ چنانچہ کئی کئی صفحے کے احکامات اُردو زبان میں اُن کے زمانے کی فائلوں میں موجود ہیں۔ اور یہ احکامات اپنے مخصوص انداز بیان کی وجہ سے ایک ادبی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا، اور اس کا سہرا خاں صاحب کے سر ہے۔

اُردو کو انہوں نے یونیورسٹی میں بلند مقام دیا۔ نہ صرف فائلوں پر اُردو میں لکھنے اور احکامات صادر کرنے کا نیا تجربہ کیا، اور ایک نئی روایت کی طرح ڈالی۔ بلکہ اُردو کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم اور ذریعۂ امتحان بنایا۔ ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جہاں ہزارہا اصطلاحات بنائی گئیں۔ مسلمانان پاکستان و ہند کی ادبی تاریخ کا شعبہ قائم کیا گیا جس کے زیر اہتمام مسلمانوں کی تاریخ ادب پر گراں قدر کام ہوا، اور اس برعظیم کی ادبی تاریخ پر بڑے سائز کی کوئی بیس ضخیم جلدیں شائع کی گئیں۔ اور غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر انہوں نے غالب کی تمام فارسی اور اُردو تصانیف کو سلیقے سے مرتب کروا کے نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے کام میں بھی انہوں نے دلچسپی لی اور اس کام کو آگے بڑھانے میں بھی انہوں نے بہت کچھ کیا۔ اُن کے یہ کارنامے ایسے ہیں کہ اُن کو پاکستان اور پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے ڈگریاں اُردو میں جاری کیں۔ کانووکیشن کے موقع پر خطبات نہ صرف خود اُردو میں دیئے بلکہ چانسلر کو بھی ایسا کرنے کی طرف توجہ

خاں صاحب اس معاملے میں خاصے سخت تھے، اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

نواب کالاباغ کی درنری کا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی میں کانووکیشن ہونے والا تھا۔ انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ میں خاں صاحب کے پاس اُن کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ کام کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھے بھی صوفے پر بٹھایا، اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گئے۔ چائے منگوائی اور باتیں کرنے لگے۔ میں اس وقت نیا نیا لندن سے واپس آیا تھا۔ خاں صاحب انگلستان کی باتیں کر رہے تھے۔ لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں بیان کر رہا تھا اور خان صاحب دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خان صاحب اٹھ کر دفتر کی میز کی طرف گئے۔ فون اٹھایا۔ جیسا کہ اُن کا اندازہ تھا نہایت شائستگی سے فون پر باتیں کرنے لگے۔

لیکن تھوڑی دیر میں دیکھا کہ خاں صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ اُونچی آواز میں باتیں کرنے لگے

ان کی لہجے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سُنا۔

"آپ نواب صاحب (نواب کالاباغ) سے کہہ دیجئے کہ میں اپنے اصول نہیں توڑ سکتا۔ میں اُردو کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُردو کے بغیر ہماری قوم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میں پاکستان میں ہر سطح پر اُردو کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ ہماری قومی زبان ہی نہیں، ہماری تہذیب کی زبان بھی ہے ـــــ میں اپنا خطبہ اُردو

میں پڑھوں گا۔ اور نواب صاحب کو بھی اُردو ہی میں پڑھنا چاہیئے"۔

میں یہ باتیں سُنتا رہا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جو صاحب انہیں ٹیلی فون کر رہے ہیں وہ چانسلر صاحب کا یہ پیغام اُن تک پہنچا رہے تھے کہ کانووکیشن کے موقع پر خطبات انگریزی میں ہونے چاہئیں۔ خان صاحب غصے میں اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس دھمکی کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے جو انہیں دی جا رہی ہے۔

بالآخر خان صاحب نے غصّے میں ٹیلی فون بند کر دیا، اور میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "یہ لطیف خاں صاحب ایجوکیشن سکریڑی خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مجھے اس طرح فون کرتے ہیں جیسے وہ میرے افسر ہیں۔ نواب صاحب کا پیغام مجھے پہنچا رہے تھے کہ کانووکیشن کے خطبات انگریزی میں ہونے چاہئیں۔ میں اس کو کیسے تسلیم کر لوں۔ اصول کا معاملہ ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ نواب صاحب سے کہہ دیجئے، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں خطبہ انگریزی میں نہیں پڑھوں گا، اُردو میں پڑھوں گا" ——

میں نے دبی زبان سے کہا بھی کہ آپ انگریزی میں خطبہ پڑھ دیجیئے۔ نواب صاحب سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں بُرا نہ مان جائیں"۔

خان صاحب کہنے لگے "نواب صاحب خود اُردو کے حق میں ہیں۔ مجھے ان کے خیالات کا بخوبی علم ہے۔ لیکن یہ لطیف خاں صاحب انہیں خواہ مخواہ غلط مشورے دیتے رہتے ہیں۔ بیورو کریٹ جو ٹھہرے" ——

چند روز کے بعد کانووکیشن ہوا۔ خاں صاحب نے خطبہ اُردو میں پڑھا۔ نواب صاحب نے بھی اُردو میں اپنا خطبہ دیا۔ لطیف صاحب کو یہ بات ظاہر ہے کہ ناگوار گذری ہوگی۔ لیکن خان صاحب نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے لطیف خان صاحب سے ان کے اختلافات بڑھتے گئے اور یہ اختلافات دشمنی کی حد تک

پہنچ گئے۔ آگے چل کر خاں صاحب کو اس کی وجہ سے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ اصول کے معاملے میں بہت سخت تھے، اور اصول کے معاملات میں مصالحت کرنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔

اس واقعے کے بعد دیر تک وہ مجھ سے اُردو کی اہمیت اور پاکستان میں اُردو زبان کی ضرورت پر باتیں کرتے رہے۔

حمید احمد خاں صاحب ایک محب وطن اور سچے پاکستانی تھے۔ اُن کے دل میں قوم کا بڑا درد تھا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ پاکستان کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے تھے تو اُن پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ پاکستان کو اسلامیانِ ہند کی تہذیب کا گہوارہ دیکھنا چاہتے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ یہ تہذیبی روایت پاکستان میں فروغ پائے۔

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ہندوستان میں تو اس تہذیب کا خاتمہ ہوگیا، اب اگر پاکستان میں اس تہذیبی روایت کو فروغ حاصل نہ ہوا تو پھر کہاں حاصل ہوگا؟ یہ تہذیب بھٹکتی پھرے گی، اور پھر ہمیں بھی بھٹکنا ہوگا۔"

اور میں اُن کی یہ باتیں خاموشی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔ اُن کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

خاں صاحب کی شخصیت میں بڑا رُعب اور دبدبہ تھا۔ دیکھنے میں وہ چھوٹے سے قد کے کمزور سے آدمی تھے لیکن اس نحیف پیکر میں پہاڑوں کا سا شان و شکوہ تھا۔ چہرے پر رُعب کی کیفیت تھی، آواز میں گرج کا سا انداز تھا۔ چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی شاہِ وقت کی سواری جا رہی ہے۔ مجھے تو اُن سے ہر وقت ڈر لگتا تھا، حالانکہ وہ میرے ساتھ بڑی ہی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ لیکن یہ شفقت اور محبت اُن کے رعب اور دبدبے میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیتی تھی۔

حمید احمد خاں صاحب بڑے ہی وضع دار آدمی تھے، اور یہ وضع داری اُن کی ہر بات اور ان کے عمل میں جھلکتی تھی۔ چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور بڑوں کی عزت کرتے۔ پھر جس سے جس طرح اور جس نوعیت کے تعلقات ہوتے اُن کو زندگی بھر نباہتے تھے۔ جن لوگوں کو عزیز رکھتے تھے انہیں مصروفیت کے باوجود اپنے ہاتھ سے خط لکھتے تھے۔

میں جن دنوں لندن میں تھا۔ خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میں اُن کے بہت قریب تھا۔ اس لیے اکثر انہیں لندن سے خط لکھتا رہتا تھا۔ بعض باتیں اِن خطوں میں یونیورسٹی سے متعلق ایسی ہوتی تھیں۔ جن کی نوعیت دفتری اور سرکاری ہوتی تھی۔ لیکن خاں صاحب اِن باتوں کا جواب بھی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں مانیں گے میں نے اُن کو کئی بار لکھا کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔ کم از کم دفتری باتوں کا جواب کسی مددگار سے لکھوا دیا کیجیے لیکن ہمیشہ یہ جواب آیا کہ میں آپ کو سرکاری حیثیت سے خط نہیں لکھتا۔ میں تو آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں اور چھوٹے بھائی کو دفتری خط نہیں لکھا جاتا۔
اور مجھے ہمیشہ اُن کی ایسی تحریریں دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔

حمید احمد خاں صاحب میں شفقت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اپنے رفقاء اور طلباء سب پر شفقت فرماتے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا، ہر ایک کا کام کر دیتے تھے۔ زود رنج ضرور تھے اور جلدی ناراض بھی ہو جاتے تھے اور بے قاعدگی، دروغ گوئی کو ناپسند کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں ایک اُستاد سے ناراض ہو گئے۔ بات کچھ ایسی تھی کہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، لیکن ضابطے کی تمام کارروائیوں کے باوجود جو انہیں کرنی پڑیں انہوں نے نہ صرف اُس اُستاد کا خیال رکھا۔ بلکہ دفتر کو ہدایت کی کہ اُن کو اور اُن کے بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ میڈیکل آفیسر کو خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ اُن کے علاج معالجے میں کوئی تساہلی نہ برتی جائے۔

خاں صاحب بلڈ پریشر کے مریض تھے، جلدی برہم ہو جاتے تھے۔ غصہ ان کی ناک پر رکھا رہتا تھا۔ ویسے مجلسی آدمی تھے لیکن ملنے آنے والوں سے گھبراتے بھی تھے۔ خاص طور پر اگر طالب علم یا ایسے لوگ جن سے وہ کوئی خاص تعلق نہیں رکھتے تھے، گھر پہنچ جائیں تو انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اورنٹیل کالج کا پرنسپل ہو چکا تھا۔ میں نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی تھی، اور اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کے پروگرام پر اس میٹنگ میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا، کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے فون اٹھایا۔ آواز آئی "میں حمید احمد خاں بول رہا ہوں"۔

میں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "آپ کا مزاج بخیر ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت"؟

کہنے لگے "اورنٹیل کالج کے شعبۂ عربی کے چند طالب علم میرے گھر پر آئے ہیں کیا آپ نے انہیں یہاں آنے کی اجازت دی ہے"؟

میں نے کہا "میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اجازت نہیں دی۔ یہ لوگ آپ کے پاس جانے سے قبل مجھ سے ملے بھی نہیں"۔۔۔

خاں صاحب غصے سے بے حال ہو رہے تھے۔ کہنے لگے "ان لوگوں نے میرا بہت سا وقت ضائع کیا ہے۔ مجھے پریشان بھی کیا ہے۔ میں گھر پر دفتر کا کام کر رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں آ گئے۔ پہلے مجھے فون کیا ہوتا، وقت مقرر کیا ہوتا۔ انہیں میری مصروفیات اور پریشانیوں کا علم ہونا چاہیئے۔ آخر اورنٹیل کالج کے امتحان کے معاملات سے میرا کیا تعلق ہے۔

میں نے کہا "آپ ان طالب علموں کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں مسئلے کو حل کر دوں گا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ آپ کے پاس پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو آداب نہیں آتے"۔

آواز آئی "جزاک اللہ! آپ نے میری پریشانی کو دور کر دیا۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں"۔

میں نے کہا "میں آپ کا خادم ہوں"۔

میری باتیں سُن کر خاں صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور وہ مجھ سے فون پر ذاتی نوعیت کی باتیں کئی منٹ تک کرتے رہے۔

وہ لڑکے تھوڑی دیر میں میرے پاس آ گئے۔ میں نے اُن کی باتیں سُنیں۔ باتیں معمولی سی تھیں۔ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صدر شعبۂ عربی میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے مشورے سے دو منٹ میں میں نے مسئلے کو حل کر دیا۔ خاں صاحب کو اطلاع بھی دے دی۔ بہت خوش ہوئے اور بزرگوں کی طرح سینکڑوں دعائیں دیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اصول پسند آدمی تھے۔ کبھی کوئی غلط بات نہیں کرتے تھے۔ دیانت داری اُن پر ختم تھی۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود وہ سفارش کر دیتے تھے، خاص طور پر ایسے افراد کی جو ضرورت مند ہوتے تھے، اور جن کے بارے میں انہیں یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ آگے چل کر معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں۔ داخلوں اور ملازمتوں کے لیے ان کے دوست احباب اکثر ان کے پاس آتے تھے۔ خاں صاحب سفارش کر دیتے تھے لیکن ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ "جب آپ کا کام ہو جائے تو مجھے اطلاع ضرور کر دیجیے گا"۔ لیکن ہوتا یہی تھا کہ کام ہو جانے کے بعد اطلاع انہیں کم ہی ملتی تھی۔ اور وہ احباب سے اس بات کے شکوہ سنج رہتے تھے۔

ان کی اصول پسندی اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ صبح کو اخبار کا وہ کالم سب سے پہلے پڑھتے تھے، جس میں شہر کے اہم لوگوں کے انتقال کی خبر ہوتی تھی۔ اور خاں صاحب کسی شادی میں شرکت کے لیے جائیں یا نہ جائیں، کسی کے انتقال کے موقع پر سب سے پہلے پہنچتے تھے، اور آخر وقت تک جنازے کے ساتھ چلتے تھے۔

میں نے ایک دن کہا "آپ جنتی آدمی ہیں، کوئی مرجائے تو اس کے جنازے میں ضرور شریک ہوتے ہیں"۔

خاں صاحب کہنے لگے "آدمی ایسے ہی مواقع پر پہچانا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پر تو سب ہی شریک ہوجاتے ہیں، بات تو جب ہے کہ انسان غم میں شریک ہو۔ مسلمانوں کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔ کوئی جنازہ جارہا ہو تو سارا ٹریفک رُک جاتا ہے اور لوگ دوکانوں سے نیچے اُتر کر کندھا دیتے ہیں۔ گویا اس کے غم کو بانٹتے ہیں۔ اس کا اثر پس ماندگان پر اچھا ہوتا ہے"۔

بظاہر تو حمید احمد خاں صاحب سخت آدمی تھے۔ لیکن اُن کا دل نہایت نرم تھا۔ کسی کی پریشانی کو دیکھ کر پریشان ہوجاتے تھے۔ اصل میں لٹریچر کے مطالعے نے انسانی رشتوں کا احساس دلا کر انہیں جذباتی بنا دیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ڈھاکہ میں اُردو اور بنگلہ کے ادیبوں کی کانفرنس تھی اُس میں شرکت کے لیے تین اشخاص پر مشتمل ایک وفد بھیجا گیا، اس وفد میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اور غلام عباس صاحب کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔

ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے اور شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ہر اجلاس کے بعد جب ہوٹل جانے کا وقت آتا تھا۔ تو خاں صاحب مجھ سے کہتے تھے "عبادت صاحب! اب گھر چلئے۔ دیکھئے یہ ہوٹل ہمارا ایک دن کا گھر ہے۔ لیکن گھر تو ہے۔ گھر بھی خوب چیز ہے"۔

اور میں ان کی ایسی باتیں سن کر ہاں میں ہاں ملاتا رہتا تھا۔

حمید احمد خاں صاحب کے مزاج میں بڑی باقاعدگی تھی۔ لباس میں رہن سہن میں۔ گفتگو اور بات چیت میں، غرض ان کے ہر عمل میں باقاعدگی کا احساس ہوتا تھا اور ان کے ایک ایک انداز سے وضع داری ٹپکتی تھی۔

ایک دن میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو خاں صاحب فون پر کسی سے محو گفتگو تھے اور کہہ رہے تھے "میرا نام حمید احمدؐ خاں ہے، حمید یا حمید احمدؐ نہیں ہے — میرا پورا نام ہی میرا صحیح نام ہے"۔

میں چپکے سے صوفے پر بیٹھ گیا اور اُن کی یہ دلچسپ باتیں سنتا رہا۔ ٹیلی فون بند کر کے خاں صاحب میرے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "میں اس شخص کو فون پر ڈانٹ رہا تھا۔ مجھے حمید صاحب یا حمید احمد کہتا ہے —— میرا نام حمید احمدؐ خاں ہے — اس کو معلوم ہونا چاہیئے"۔

میں نے کہا "بات تو صحیح ہے، آپ نے اچھا کیا کہ اس شخص کو احساس دلایا۔ ناموں کا بگاڑنا یا پورا نام نہ لینا غلط بات ہے اور وضع داری، تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے"۔

خاں صاحب کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ وہ جب کیمبرج میں دو سال گذارنے کے بعد ایم۔ اے کی ڈگری لے کر واپس آئے تو اپنے ساتھ ایک چھوٹی موٹر مارس مائنر بھی لائے۔ یہ سبز رنگ کی موٹر وہ خود چلاتے تھے، اور اس سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن اس موٹر کے آجانے کے باوجود خاں صاحب نے عرصہ دراز تک سائیکل کو خیرباد نہیں کہا۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اسلامیہ کالج سے موٹر میں چلتے تھے، اورینٹل کالج آتے تھے۔ اُن کی سائیکل اورینٹل کالج میں رکھی رہتی تھی۔ یہاں سے جب انہیں شہر میں کہیں بھی جانا ہوتا تھا، تو وہ سائیکل پر جاتے تھے۔ اُن کی سائیکل میری تحویل میں رہتی تھی۔ جب بھی انہیں ضرورت ہوتی تھی، میں سائیکل انہیں دے دیتا تھا، اور وہ نوجوانوں کی طرح اس پر بیٹھ کر، جہاں بھی جانا ہوتا تھا۔ فراٹے بھرتے ہوئے چل دیتے تھے۔

ایک دن میں نے کہا کہ "آپ اپنی موٹر یہاں تک لے آتے ہیں۔ آگے بھی

اس کو لے جایا کیجئے۔

خاں صاحب کہنے لگے۔ "شہر کی تنگ سڑکوں پر موٹر کا چلانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ٹریفک کی وجہ سے تکلیف بھی ہوتی ہے، اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میرے اندر کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ یہ احساس میں شہر کے لوگوں کو دلانا نہیں چاہتا وضع داری کا تقاضا یہ ہے کہ موٹر کے ساتھ سائیکل بھی چلائی جائے۔ سائیکل میرا بہت پرانا ساتھی ہے۔ عبادت صاحب! اس کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں"۔

جب تک خاں صاحب میں سائیکل چلانے کی سکت رہی، ان کا یہی معمول رہا۔ ان کی وضع داری کا ایک واقعہ اور ہے جس کو میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی علالت نے جب طول کھینچا تو صدر پاکستان ایوب خاں صاحب نے انہیں آرام کرنے کے مری بُلایا۔ اخبار میں یہ خبر شائع ہو گئی کہ وہ فلاں تاریخ کو بذریعہ تیز گام کراچی سے پنڈی روانہ ہوں گے۔

میں نے خبر پڑھ کر اندازہ لگا لیا کس دن اور کس وقت مولوی صاحب مرحوم کی گاڑی لاہور پہنچے گی۔ چنانچہ میں وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔

گاڑی آنے سے چند منٹ قبل دیکھا کہ حمید احمد خاں صاحب سامنے سے چلے آرہے ہیں بعد میں مولانا حامد علی خاں اور ابن انشاء بھی آگئے۔

حمید احمد خاں صاحب کی طبیعت اس دن خراب تھی، انہیں نزلہ، زکام اور بخار تھا لیکن اس کے باوجود وہ مولوی صاحب مرحوم سے اسٹیشن پر ملنے آئے۔ جتنی دیر تک گاڑی ٹھہری رہی، ہم لوگ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اور ان سے باتیں کرتے رہے۔

خاں صاحب زوردار آدمی تھے۔ جو چاہتے کرتے تھے۔ جو چاہتے تھے وہ کر لیتے تھے لیکن حفظ مراتب کا خیال کسی حال میں بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ کمیٹیوں میں

خاص طور پر وہ ایک کی بات سنتے تھے، اور اپنی بات کہتے تھے اور اختلاف ہوتا تھا تو اس اختلاف کو بڑے سلیقے سے پیش کرتے تھے۔

ایک واقعہ آج تک مجھے یاد ہے۔

یونیورسٹی کی کمیٹی فار ہائر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کی میٹنگ تھی۔ میں اس میں صدر شعبہ اُردو اور پرنسپل اورینٹل کالج کی حیثیت سے شریک تھا۔ میری ایک شاگرد نے سید انشا پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کے لیے درخواست پیش کی تھی۔ مختلف کمیٹیوں سے گذر کر موضوع کا خاکہ اور کتابیات اس کمیٹی تک پہنچا جو میرے خیال میں مکمل تھا، اور میں نے یہ سفارش کی تھی کہ سید انشاء پر کام ہونا چاہیئے۔ اس کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے۔

جب یہ درخواست کمیٹی میں زیر بحث آئی تو انگریزی ادبیات کے پروفیسر سراج الدین صاحب نے یہ کہا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کسی مسئلے یعنی (Problem) پر ہونا چاہیئے، جیسے کہ انگریزی ادب اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً انشاء کی شخصیت اور شاعری پر کام مناسب نہیں۔ اس کے عشق پر ہو سکتا ہے۔ اس پر کمیٹی میں بڑے قہقہے بلند ہوئے۔ اس لیے کہ بات دلچسپ لیکن مضحکہ خیز تھی لیکن بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف ممبروں نے مختلف رائے دی۔ خاں صاحب نے بھی بہت کچھ کہا، اور یہ رائے ظاہر کی کہ سراج صاحب صحیح کہتے ہیں۔ میں اپنے موقف پر اڑا رہا کہ انشاء پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ اس لیے اُن کی شخصیت اور شاعری پر بنیادی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی پینتالیس منٹ تک اس بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ممبر پریشان ہو گئے، اور انھوں نے یک زبان ہو کر یہ کہا کہ آگے چلئے۔ خان صاحب وائس چانسلر کی حیثیت سے اس کمیٹی کی صدارت کر رہے تھے، میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب (یعنی میں) آگے چلیں گے تو میں چلوں گا۔"

اس پر میں نے کہا "آپ کمیٹی کے صدر ہیں، وائس چانسلر ہیں، جس طرح چاہیں فیصلہ فرمائیے"۔

خان صاحب کہنے لگے "اچھا کسی وقت ہم دونوں بیٹھ کر اس پر مزید تبادلۂ خیال کرلیں گے، اور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے"۔

چنانچہ ہم لوگ چند روز کے بعد بیٹھے اور معمولی ترمیم کے ساتھ ہم نے اس موضوع کو متفقہ طور پر منظور کرلیا۔

اور میں خان صاحب کی عالی ظرفی اور معاملہ فہمی کا ایک دفعہ پھر قائل ہوگیا۔

دوسرا واقعہ ایک لکچرار کے تقرر کے سلسلے میں سلیکشن بورڈ کی میٹنگ میں پیش آیا۔

میں جون ۱۹۶۶ئ میں لندن سے واپس آیا، اور میں نے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اورینٹل کالج میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ شعبے کو ایک لکچرار کی ضرورت تھی۔ میں 'ایڈہاک' کے طور پر تقرر کرسکتا تھا لیکن میں نے مصلحتاً ایسا نہیں کیا، اور یونیورسٹی کو لکھا کہ اس پوسٹ کا اشتہار دے دیا جائے۔ چنانچہ اشتہار دے دیا گیا۔ درخواستیں آئیں۔ معاملہ سلیکشن بورڈ میں پیش ہوا۔ خاں صاحب ایک شخص کا تقرر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اس دو چار سوال کیے تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل کورا ہے۔ خاں صاحب کہتے تھے، اس کا تقرر کر لیجیے۔ میں نے اختلاف کیا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ابھی اس تقرر کو ملتوی کیا جائے۔ پھر اشتہار دیا جائے۔ شاید کچھ اچھے لوگ درخواستیں دیں۔ بورڈ میں خانصاحب کے ساتھ میرا اختلاف ہوا، اور خاصی دیر تک گرما گرم بحث ہوئی۔ میں میٹنگ سے بددل ہوکر واپس آیا، اور یہ سوچتا رہا کہ خاں صاحب یقیناً مجھ سے ناراض ہوئے ہونگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میری پروفیسری کا معاملہ زیر غور تھا۔ اکسپرٹس کی دو رپورٹیں آچکی تھیں، صرف ایک رپورٹ رہ گئی تھی۔ اس اختلاف کی وجہ سے مجھے یہ خیال ہوا کہ خاں صاحب ناراض ہیں، اب پروفیسر ہونا مشکل ہے۔ اس لیے شاید لندن واپس

ہی جانا پڑے۔ گھر واپس آکر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اُٹھایا۔

آواز آئی "میں حمید احمد خاں بول رہا ہوں۔ آپ کو مبارک باد دینے کے لیے فون کر رہا ہوں۔ آپ اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ تیسری رائے تار کے ذریعہ آئی۔ میں نے سلیکشن بورڈ کی اسی میٹنگ میں اس معاملے کو رکھ دیا، حالانکہ یہ ایجنڈے پر نہیں تھا۔ لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہو جائے۔ بہر حال مبارکباد قبول کیجئے۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہو گی تو تفصیل آپ کو بتاؤں گا۔ میرا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔"

یہ خوش خبری سُن کر میری زبان سے نکلا "بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت عظیم انسان ہیں۔"

دوسرے دن خاں صاحب سے مُلاقات ہوئی تو انہوں نے تفصیل سُنائی اور کہا جب سے آپ لندن سے واپس آئے ہیں، میں نے آپ کی پروفیسری کے بارے میں آپ سے کوئی بات نہیں کی۔ دراصل میرے لیے یہ بڑی آزمائش اور امتحان کا وقت تھا۔ میں نے آپ کو اسی پروفیسری کی خاطر سال بھر قبل لندن سے بُلا لیا تھا۔ لیکن میری ہمت نہیں پڑی کہ آپ سے بات کروں۔ کیونکہ معاملہ نازک تھا۔ میرے عزیز دوست وقار عظیم صاحب نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دے دی تھی، اور میرے اوپر مختلف لوگوں کی طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ شعبے میں سینئر ریڈر ہیں، اس لیے آپ ہی کو پروفیسر ہونا چاہیئے۔ مشکل یہ تھی کہ ایک اکسپرٹ سیّد امتیاز علی تاج نے آپ کے حق میں رائے نہیں دی تھی۔ صرف ایک صاحب کی رائے آپ کے حق میں تھی۔ تیسرے اکسپرٹ ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کی رائے کا انتظار تھا۔ اور اسی پر پروفیسری کے فیصلے کا انحصار تھا۔ انہوں نے اپنی رائے ایکسپریس ٹیلی گرام کے ذریعے بھیجی۔ تار میرے نام تھا۔ اس لیے سلیکشن بورڈ کی میٹنگ ہی میں میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ پہلے دو

مہینے دوسری میٹنگ کا انتظار کرنے کی بجائے اسی میٹنگ میں پروفیسر کا معاملہ پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے فائل منگوائی، اور اسی میٹنگ میں اس کو پیش کر دیا۔ ممبروں نے متفقہ طور پر آپ کے حق میں فیصلہ کیا، مجھے خوشی ہوئی۔ میرے سر کا بوجھ اُتر گیا، اور میں نے میٹنگ کے بعد آپ کو یہ خوش خبری سُنا دی"۔

میں نے کہا "آپ کا احسان ہے ورنہ کوئی دوسرا وائس چانسلر ہوتا تو کئی مہینے اور لگ جاتے۔ میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں"۔

خاں صاحب نے یہ کہہ کر مجھے رخصت کیا کہ "خوش رہیئے۔ اور خوب دل لگا کر کام کیجئے۔ اب آپ ہی آئندہ اورینٹل کالج کے پرنسپل ہوں گے۔ اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے"۔ غرض خاں صاحب کی اس شفقت اور محبت نے مجھے کچھ اور بھی اپنا گرویدہ بنا لیا، اور آج بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ کس قدر کھرے، صاف گو، معاملہ فہم مخلص شفیق، با اصول اور با قاعدہ انسان تھے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۹۷۰ء میں پروفیسر ہونے کے کوئی تین سال بعد ہی میں اورینٹل کالج کا پرنسپل ہو گیا۔ سنڈیکیٹ نے متفقہ طور پر میرے حق میں فیصلہ کیا۔ گیارہ بارہ سال تک میں پرنسپل رہا، اور مجھے کام کرنے کے اچھے مواقع ملے جس کی وجہ سے اورینٹل کالج کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ چین، ترکی، اردن، شام اور ایران وغیرہ میں اس کو لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل سٹڈیز کی طرح اہم سمجھا جانے لگا، اور امریکہ، کینیڈا روس، چین، انگلستان، جرمنی، فرانس، ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان تمام ممالک کی یونیورسٹیوں کے سربراہوں نے اورینٹل کالج کے علمی اور تعلیمی کام کی تعریف کی۔ اس طرح اورینٹل کالج بین الاقوامی شہرت کا ایک ادارہ بن گیا۔

اور یہ سب کچھ خاں صاحب کی شفقت اور محبت کا نتیجہ تھا۔

حمید احمد خاں صاحب کوئی چھ سات سال پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر

رہے، اور مجھے اُردو کے پروفیسر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ہر معاملے میں میرے ساتھ تعاون کیا، انہوں نے اس زمانے میں اورینٹل کالج اور مشرقی علوم سے گہری دلچسپی لی۔ اُن کی اس دلچسپی کی وجہ سے اورینٹل کالج کا وقار بلند ہوا اور بین الاقوامی سطح پر اس ادارے کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ امریکہ، انگلستان، جرمنی، روس، چین، ترکی، اُردن، شام، اور ایران وغیرہ میں اس کو لندن یونیورسٹی کے ۔ اسکول آف اورینٹل سٹڈیز کی طرح اہم سمجھا جانے لگا۔ ادبی تحقیق اور طباعت واشاعت کے جو منصوبے میں نے بنا کر پیش کیے، ان سب کو انہوں نے منظور کر لیا۔ چنانچہ اورینٹل کالج سے نادر و نایاب علمی، ادبی کتابوں کی اشاعت غالب کی تمام فارسی اردو تصانیف کی از سر نو ترتیب و تدوین، اور طباعت واشاعت تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی ترتیب و تسوید، اور طباعت واشاعت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ دنیا کی شاید ہی کسی یونیورسٹی میں اسلامیان ہند کی تہذیب و ثقافت پر اتنا کام ہوا ہو جتنا پنجاب یونیورسٹی میں ان کی وائس چانسلری کے زمانے میں ہوا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زمانہ پنجاب یونیورسٹی کا سنہری دور تھا۔

خاں صاحب پروفیسر تو انگریزی زبان وادب کے تھے لیکن مشرقی ادبیات، اور خصوصاً اُردو زبان وادب سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے کیمبرج میں اپنی ام۔ لٹ کے لیے جو ریسرچ کی اُس کا موضوع بھی مغربی اور مشرقی شاعری کا تقابلی مطالعہ تھا۔ وہ کیمبرج میں دو سال سے زیادہ نہ رہ سکے، کیونکہ بہت سی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر تقریباً پچپن سال کی عمر میں کیمبرج گئے تھے۔ اگر انہیں زیادہ وقت ملتا تو وہ یقیناً پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے واپس آتے۔ لیکن لاہور میں اُن کی نجی اور سرکاری ذمہ داریاں بہت تھیں، اس لیے انہیں دو سال کے اندر واپس آنا پڑا۔ بہر حال اس مختصر عرصے میں انہوں نے جو کام کیا، اس کو انگلستان، پاکستان اور ہندوستان میں بہت سراہا گیا۔

غالب، اقبال، حافظ اور حضرت امیر خسروؒ کے وہ شیدائی تھے، اور شیکسپیئر اکثر ملٹن براؤننگ، شیلے اور کیٹس کو پڑھاتے ہوئے، وہ ان شعراء سے ان کا مقابلہ ضرور کرتے تھے۔ تنقید پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ برسوں انہوں نے انگریزی زبان وادب کے طالب علموں کو تنقید کا درس دیا تھا۔ وائس چانسلر ہونے کے باوجود انہوں نے تنقید سے اپنی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ اسی دلچسپی کی وجہ سے وہ اورینٹل کالج میں اردو ادب کے طالب علموں کو ہفتے میں دو دفعہ تنقید پر لکچر دینے کے لیے آتے تھے۔ تنقید کا پرچہ ہمیشہ سے میں پڑھاتا تھا، لیکن جب میں پانچ سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے لندن چلا گیا تو تنقید پڑھانے والے کی تلاش شروع ہوئی۔ اس پرچے کا پڑھانا آسان کام نہ تھا۔ شعبے کے اساتذہ میں سے کسی نے تنقید کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ جو لوگ اس کام کے لیے مقرر کیے گئے، انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ بیکار سمجھ کر طالب علموں کو ٹرخانے کی کوشش کی۔ اس کا علم خاں صاحب کو بھی ہوا، اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود تنقید کے موضوع پر ہفتے میں دو گھنٹے لکچر دیں گے۔ اُن کے لکچر بڑے ہی عالمانہ ہوتے تھے۔ ان سے اُردو کے طالب علموں کو بہت فائدہ ہوا۔ ادب اور تنقید کے صحیح ذوق کی شمع اُن کے دلوں میں روشن ہوئی، اور ادب کو سمجھنے کا صحیح مذاق اُن کے اندر پیدا ہوا۔

اُردو ادب سے خاں صاحب کو گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے انگریزی ادبیات کے ساتھ ساتھ اُردو کے کلاسیکی اور جدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر نہایت گراں قدر مقالات لکھے تھے جو رسالہ اُردو، ہمایوں، ادبی دنیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین میں شائع ہوئے تھے۔ غزل اور غالب سے انہیں بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اِن موضوعات پر جو اہم تحقیقی اور تنقیدی کام انہوں نے کیا ہے، اُس کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برسوں تک اُردو ادب کے طالب علم ان سے استفادہ

کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ حالی اور اقبالؒ سے بھی انہیں دلچسپی تھی، اور قومی وملی شاعروں کی حیثیت سے خاں صاحب ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں بھی گراں قدر مضامین لکھے تھے جو شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

خاں صاحب کو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ دونوں زبانوں کے لکھنے اور بولنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ اس لحاظ سے صرف بخاری صاحب (پطرس)، کو اُن کو مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اُن کی تحریر میں ادبیت تھی، اور بولنے میں فن خطابت (oratory) کا رنگ و آہنگ۔

خاں صاحب بڑے ہی وضع دار آدمی تھے۔ بزرگوں کی عزت کرتے تھے اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ اُن کے طالب علم اُن پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ وہ انہیں بقول شخصے شیر کی آنکھ سے دیکھتے لیکن شہد کا نوالہ کھلاتے تھے۔ طالب علموں کی بہتری کا خیال ہر لمحہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔

ان کی وائس چانسلری کا زمانہ سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ آئے دن حکومتیں بدلتی رہتی تھیں۔ ان حکومتوں کو اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے طالب علموں پر تشدد بھی کرنا پڑتا تھا۔ خاں صاحب طالب علموں کی خاطر حکومت سے ٹکر بھی لے لیتے تھے۔

ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ جنرل موسیٰ کی گورنری کا زمانہ تھا۔ وہ نئے نئے گورنر ہو کر آئے تھے۔ اس لیے اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے اپنی کارکردگی دکھانا چاہتے تھے۔ ایک دن انہیں یہ علم ہوا کہ کل صبح یونیورسٹی اور اس کے تمام کالجوں کے طالب علم حکومت کے خلاف جلوس نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ بات اُن کی برداشت سے باہر تھی۔ انہوں نے خاں صاحب کو فون کر کے گورنر ہاؤس میں طلب کیا، اور سٹین گن اور برین گن قسم کے ہتھیار دکھا کر یہ کہا کہ ان کے

ایک فائر سے اتنے آدمی مرتے ہیں۔ کل اگر طالب علموں نے جلوس نکالا تو ان بندوقوں کو استعمال کیا جائے گا اور قتل عام ہوگا۔"

خاں صاحب نے کہا "طالب علموں کے قتل عام کے لیے اتنی مشین گنوں کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل جلوس نہیں نکلے گا۔ میں ابھی جا کر پرنسپلوں کی میٹنگ بلاتا ہوں۔ وہ طالب علموں کو سمجھا بجھا دیں گے۔"

چنانچہ وہ رات گیارہ بجے سیدھے دفتر واپس ہوئے، اور وہاں سے سب پرنسپلوں اور اہم سینئر اُستادوں کو فون کیا۔

کوئی ساڑھے گیارہ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں دس بجے سونے کا عادی ہوں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جگا دیا۔ فون اٹھایا۔ آواز آئی۔

"میں حمید احمد خاں بول رہا ہوں۔ ضروری میٹنگ ہے۔ اسی وقت، ابھی ابھی، آپ فوراً آجایئے۔ جب آپ یہاں آجائیں گے تو تفصیل بتاؤں گا۔"

میں جلدی جلدی کپڑے بدل کر چند منٹ میں وائس چانسلر کے دفتر پہنچ گیا۔ اور لوگ بھی آگئے۔

خاں صاحب کہنے لگے "میں نے آپ لوگوں کو اتنی رات گئے زحمت دی لیکن مجبور ہوگیا۔ گورنر صاحب نے مجھے بُلایا تھا، اور کہتے تھے کل اگر جلوس نکلا تو طالب علموں پر اسٹین گن اور برین گن چلے گی اور قتل عام ہوگا۔ میں ان سے وعدہ کر کے آیا ہوں کل جلوس نہیں نکلنا چاہیئے۔ یہ میری بھی عزت کا معاملہ ہے۔"

صبح کو ہم سب نے اپنے اپنے کالجوں میں طالب علموں کے لیڈروں کو بُلایا، انہیں سمجھایا صورت حال کی نزاکت کا احساس دلایا، اور انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ جلوس نہیں نکالیں گے۔"

اس طرح خاں صاحب کی مستعدی اور دانش مندی سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔

اسلامیہ کالج خاں صاحب کی کمزوری تھا۔ انہوں نے ایک زمانہ بحیثیت پروفیسر اور پرنسپل اسلامیہ کالج میں گذارا تھا۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے معاملات میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ دخیل ہونا چاہیئے، چنانچہ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں میں اسلامیہ کالج کے لوگ زیادہ سے زیادہ نامزد ہوں۔ وہ سنڈیکیٹ، سینٹ اور دوسری کمیٹیوں کے ممبر تھے، اس لیے وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے تو اسلامیہ کالج کے کئی اُستادوں کو یونیورسٹی کے اسٹاف پر بھی لے آئے۔

ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کی وجہ سے یونیورسٹی کی فضا خراب ہوئی — انہوں نے خاں صاحب سے غلط قسم کے فائدے حاصل کیے، اور بعض ایسے کام بھی اُن سے کروائے جس سے اُن کی سُبکی ہوئی اور ان کی شہرت کو بھی نقصان پہنچا۔

ایک صاحب ان میں ایسے تھے جنہیں شر کی پوٹ کہا جائے تو بے جا نہیں۔ کئی سال پولیس میں کانسٹیبل رہے۔ اس کے بعد جوڑ توڑ کر کے کسی پرائیویٹ کالج میں لکچرار ہو گئے۔ اُردو میں ایم۔ اے نہیں تھے لیکن کسی طرح خاں صاحب کی رسمی سفارش پر اورینٹل کالج میں عارضی طور پر آ گئے۔ اصولی طور پر یہ بات غلط تھی۔ اس لیے کہ یونیورسٹی میں لکچرار ہونے کے لیے اس مضمون میں کم سے کم فرسٹ کلاس میں ایم۔ اے ہونا ضرور تھا۔

تین چار سال اسی طرح گذر گئے۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو مستقل کرواتے کے لیے ایک عجیب کھیل کھیلا۔ یعنی پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو اور پرنسپل کی سفارش کے بغیر ایک مستشرق، جس کا اُردو سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ بالا ہی یہ سفارش کروائی کہ ان کو کنفرم ہونا چاہیئے۔

خاں صاحب نے غضب یہ کیا کہ اس کو سنڈیکیٹ میں رکھ کر پاس کروا لیا، اور اس طرح یہ صاحب کنفرم ہو گئے۔

جب اس میٹنگ کی روداد صدر شعبۂ اُردو اور پرنسپل کی حیثیت سے میرے پاس بھی آئی تو میں اُس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، اور جس طرح ہوا تھا، وہ ضابطے کے خلاف تھا۔ اور مجھے خاں صاحب کے لیسے بااصول اور محتاط انسان سے اس بے ضابطگی کی توقع نہیں تھی۔

میں نے یہ روداد دیکھ کر اسٹینو گرافر کو بلایا، اور اس مضمون کا خط لکھوا دیا کہ کیا اِس سلسلے میں صدر شعبہ اور پرنسپل سے دریافت کیا گیا تھا۔ کنفرمیشن کا ایک طریقہ اور ضابطہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ مجھے فائل بھیجی جائے تاکہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ اس معاملے میں قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کیسے ہوئی۔

اس خط کے جواب میں فائل تو خیر کیا آتی، خاں صاحب کا پیغام لے کر رجسٹرار صاحب سید شمشاد حیدر مرحوم میرے پاس آئے، اور کہنے لگے۔

"مجھے وائس چانسلر صاحب نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ مجھ سے ایک فروگذاشت ہو گئی ہے، ایسا ہونا نہیں چاہیئے تھا۔ آپ کا مؤقف صحیح ہے۔ میں ذاتی طور پر اس کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں"۔

میں اس پیغام کے بعد کیا کہتا، خاموش ہو گیا۔ سید شمشاد حیدر صاحب دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے، اور یونیورسٹی کی اس بدنظمی کے اسباب بیان کر کے اپنی طرف سے بھی معذرت کرتے رہے۔

اس کے نتیجے میں کئی سال تک اس شخص نے جو دھما چوکڑی مچائی، اُس سے خاں صاحب بھی نالاں ہوئے، اور ان کے بعد آنے والے دوسرے وائس چانسلر بھی۔

یہ واقعہ ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے کئی سال تک خاں صاحب کچھ کھنچے کھنچے سے رہے جب بھی کہیں ملتے تو پوچھتے "غنڈہ گردی کا کیا حال ہے"؟

میں ہمیشہ یہی جواب دیتا "آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ سب کچھ آپ کے

علم میں ہے"۔

ایک شام خاں صاحب ڈاکٹر عبید اللہ خاں کے ہاں کسی تقریب میں ملے۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب، مولانا حامد علی خاں صاحب اور پروفیسر سید وقار عظیم صاحب بھی موجود تھے۔

میں پہنچا تو خاں صاحب نے یہی سوال کیا "غنڈہ گردی کا کیا حال ہے"؟

میں بھرا بیٹھا تھا۔ اضطراری طور پر میری زبان سے نکلا کہ "غنڈوں کی آپ نے بھی پرورش کی ہے، اور اب وہ دندناتے پھرتے ہیں"۔

خاں صاحب کو میری یہ بات ناگوار ہوئی۔ چُپ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح مجھے ان کا ایک خط ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ "عبادت صاحب آپ نے کل شام مجھ پر ایک الزام لگایا جس کی وجہ سے میں رات بھر سو نہ سکا۔ اس لیے یہ خط لکھ کر اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر رہا ہوں۔ میں نے غنڈہ گردی کو کبھی سہارا نہیں دیا، البتہ میں شر سے ڈرتا ضرور ہوں۔ اس لیے بعض باتیں مجھ سے ایسی ضرور سرزد ہوئی ہیں، جن کا آپ کو صدمہ ہے۔ مجھے بھی اس کا افسوس ہے"۔

اس خط کا جواب میں کیا لکھتا۔ خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے معذرت کی اور انہیں منایا۔ تھوڑی دیر میں وہ سب کچھ بھول گئے اور شفقت آمیز لہجے میں دیر تک مجھے سمجھاتے رہے۔

چند مہینے میں خاں صاحب کی وائس چانسلری ختم ہو گئی۔ ایجوکیشن سکریٹری عبداللطیف خاں صاحب مرحوم سے ان کے اختلافات روز بروز بڑھتے گئے، اور انھوں نے اُن کے خلاف اس وقت کے گورنر صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک صبح کو ایک دن اخبار میں یہ خبر چھپی کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی جگہ علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔

صبح کو یہ خبر پڑھ کر سب سے پہلے میں اُن کے مکان پر نیو کیمپس پہنچا۔ خاں صاحب اکیلے بیٹھے تھے۔ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ بہت اُداس تھے۔

اُس کے بعد چار پانچ سال کا زمانہ خاں صاحب کی زندگی کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے علامہ صاحب نے کسی محفل میں کوئی ایسی بات اُن کے بارے میں کہہ دی جس سے وہ ناراض ہوئے۔ یونیورسٹی میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ ۱۹۶۹ء میں میں نے غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو بین الاقوامی سیمینار ترتیب دیا، اُس میں بھی تشریف نہیں لائے، اور یہ کہہ کر میری درخواست کو رد کر دیا کہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے میری بڑی توہین کی ہے"۔

خاں صاحب بڑے ہی حساس اور جذباتی انسان تھے۔ ایک دفعہ کسی کی کوئی بات انہیں ناگوار معلوم ہو، اور وہ بگڑ جائیں تو ان کا منانا مشکل ہوتا تھا۔

جب تک علامہ صاحب وائس چانسلر رہے خاں صاحب یونیورسٹی میں نہیں آئے۔ غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر غالب کی تمام تصانیف کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کا منصوبہ خاں صاحب کا عظیم کارنامہ تھا۔ یہ کتابیں یونیورسٹی سے ان کے جانے کے بعد شائع ہوئیں۔ میں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ خاں صاحب کے پاس جا کر دعوت دی، خوشامد کی لیکن وہ نہ مانے، اور غالب کی کتابوں کی اشاعت کی یہ تقریب جس کا سہرا خاں صاحب کے سر تھا ان کے بغیر ہی کرنی پڑی، اور اس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

لیکن علامہ صاحب کے جانے کے بعد جب میں نے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کا پروگرام بنایا، اور اس میں دنیا کے تمام اہم ممالک کے اسکالروں اور پروفیسروں کو لاہور میں جمع کر لیا۔ تو خاں صاحب میری درخواست پر ان جلسوں میں تشریف لائے۔ ایک اجلاس کی صدارت کی، اور ایک اجلاس میں اسلامیان پاکستان و ہند کی تہذیب

وثقافت کے موضوع پر اپنا گراں قدر مقالہ بھی پڑھا، اور مختلف طریقوں سے میری ہمت افزائی بھی کی۔

یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہونے کے بعد خاں صاحب کئی سال تک مجلس ترقئ ادب کے ناظم رہے۔ لیکن یہ منصب ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ انہیں تو اس کے بعد کہیں سفیر یا محکمۂ تعلیم کا اعلےٰ افسر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن نوکر شاہی کی سازشوں نے یہ سب کچھ نہ ہونے دیا۔ ویسے مجلس کے ناظم کی حیثیت سے انہوں نے بڑے اہم کارنامے انجام دیئے، غالب، حالی اور اقبال پر اور دوسرے کلاسیکی شاعروں پر اعلےٰ درجے کی کتابیں شائع کیں، اور اس طرح اس ادارے کے وقار کو بلند کیا۔ ظاہر ہے کہ خاں صاحب علمی اور ادبی آدمی تھے۔ اس لیے مجلس کے کام کو چلانے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ یہ منصب اُن کے شایانِ شان نہیں تھا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سچے مسلمان، کھرے پاکستانی، اور اسلامیانِ ہند کی تہذیب و ثقافت کے سچّے پرستار تھے۔ اُن کے اسی مزاج نے ان سے کئی ایسے علمی کام کروائے جس کو نہ صرف ہماری یونیورسٹی بلکہ ہماری قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اِن میں اسلامیانِ ہند کی تہذیبی اور ادبی تاریخ کا منصوبہ جس کی انیس ضخیم جلدیں یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئیں۔ یونیورسٹی میں ادارۂ تالیف و ترجمہ کا قیام، اور ہر سال یوم اقبالؒ کے موقع پر یونیورسٹی کی طرف سے اقبال لیکچرز کا اہتمام، جس میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے فلسفیوں اور ادب و شعر کے ماہروں نے خطبات دیئے، اور اردو زبان و ادب اور اسلامیانِ ہند کی تہذیب و ثقافت پر خود ان کا علمی کام ایسے کارنامے ہیں جو پاکستان کی علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں سُنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ خاں صاحب کی بے وقت موت کا ایک

سبب اقبال لکچر کی تیاری بھی تھی۔ وہ عرصے سے بیمار تھے۔ بلڈ پریشر کے مریض تھے، لیکن کام کیے جاتے تھے۔ دن دن بھر مختلف قسم کے کاموں میں مصروف رہنا اُن کا معمول تھا۔ بعض لوگوں کے اصرار پر انہوں نے سالانہ اقبال لکچر دینے کا وعدہ تو کر لیا لیکن علالت کی وجہ سے اُن میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ علامہ اقبال کے ساتھ انصاف کریں۔ فلسفیوں کو ایک بار پھر پڑھا۔ اسلامی فکر اور تہذیب و ثقافت کا ایک دفعہ پھر مطالعہ کیا، نوٹس لیئے۔ دو چار صفحے لکچر کے لکھے بھی۔ لیکن کام اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔

ایک دن میں اُن کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا، تو اپنے مخصوص انداز میں کئی گھنٹے تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے۔ "اقبال لکچر کا کام مجھے اپنے ذمے نہیں لینا چاہیئے تھا۔ کسی طرح کام آگے بڑھ نہیں رہا ہے۔ کہیں یہ لکچر میری جان ہی نہ لے لے"۔

میں نے کہا "آپ ایسی بات منہ سے نہ نکالیئے۔ خدا کرے آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے، آپ کے لیے ایسے لکچروں کا تیار کرنا کون سی بڑی بات ہے"۔

میری یہ بات سُن کر خاں صاحب خاموش ہو گئے، اور کسی گہری سوچ میں دیر تک ڈوبے رہے۔ میں نے یہ کہہ کر اجازت لی کہ "آپ آرام کیجیئے۔ تھک گئے ہوں گے"۔ خاں صاحب مجھے باہر تک رخصت کرنے کے لیے آئے۔

اس ملاقات کے تیسرے چوتھے دن تین بجے سہ پہر کے قریب مجھے یہ اطلاع ملی کہ خاں صاحب صرف دو دن کی بیماری کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خون کی قے آئی، اور پھر جانبر نہ ہو سکے۔ میں احباب کے ساتھ فوراً اُن کے گھر پہنچا، کہرام مچا ہوا تھا۔ میرے بھی آنسو نہ رُکے۔ دیر تک رُویا۔ دوسرے دن، کہ یوم قرار داد پاکستان یعنی ۲۳ مارچ تھا، ہم نے خاں صاحب کو ان کی وصیت کے مطابق گلبرگ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

رہے نام اللہ کا۔

میرے لیے خاں صاحب مرحوم ایک بزرگ، ایک بھائی، ایک دوست، ایک معلّم اور ایک ہمدرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان سے زندگی میں بہت کچھ سیکھا، اور میرے اندر دو چار خوبیاں ایسی ہیں جن پر میں فخر کر سکتا ہوں، تو وہ حمید احمد خاں صاحب ہی کی عظیم شخصیت ہی کا عکس ہیں۔

وہ میرے مربی اور محسن تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ ہر مرحلے پر مجھے سہارا دیا۔ انہوں نے میرے بے شمار کام کیے، اور مجھے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس بے ہنگم اور سفاک معاشرے میں اجنبی، تنہا اور بے یار و مددگار ہوں۔

فیض صاحب

۱

یادش بخیر لکھنؤ یونیورسٹی بھی کسی زمانے میں خوب جگہ تھی۔ ادب کے چرچے اور سیاست کے ہنگامے شاید ہی کسی یونیورسٹی نے اس طرح دیکھے ہوں جیسے کہ لکھنؤ یونیورسٹی نے دیکھے ہیں۔ میں جس زمانے میں وہاں پڑھتا تھا اس زمانے میں تو ادب کے یہ چرچے اور سیاست کے یہ ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ بڑی جان دار اور صحت مندانہ فضا تھی۔ گوشے گوشے سے زندگی کے طوفان اُمڈتے تھے۔ دلوں میں نئی اُمنگیں انگڑائیاں لیتی تھیں اور نئے جنوں کے لیے نئے ویرانوں کی تلاش کا خیال ہر طرف برسات کے بادلوں بلکہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح چھایا ہوا نظر آتا تھا۔

۴۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور اپنے عنفوانِ شباب کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ ہر طرف جدید ادب کا چرچا تھا۔ ادبی محفلوں، رسالوں اور اخباروں میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر گرما

گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی میں جدید ادب کے کئی علم بردار موجود تھے، ڈاکٹر علیم، احمد علی صاحب، سید احتشام حسین صاحب، علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی وغیرہ کی موجودگی سے وہاں جدید ادب کا اچھا خاصا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ نئے رسالے آتے تھے اور ان میں نئے لکھنے والوں کی جو تخلیقات شائع ہوتی تھیں، ان کو نہ صرف شوق و اشتیاق سے پڑھا جاتا تھا بلکہ ان کی جانچ اور پرکھ بھی ہوتی تھی —— ایک ایک نظم پر ایک ایک غزل اور ایک ایک کہانی پر ہفتوں اور مہینوں بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

جدید شاعروں میں فیض، راشد اور میراجی اس زمانے میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی نظمیں اس زمانے کے رسالوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں اور جدید شاعری کے پرستار انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور بلاشبہ ان نظموں میں انہیں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے فیض کی شاعری سے اسی زمانے میں آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ان کی کچھ ہلکی پھلکی رومانی نظمیں لاہور کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ بعض ترقی پسند دوستوں پر ان نظموں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں انقلاب کی گھن گرج کے فقدان سے وہ کچھ مایوس سے ہوئے، اور انہوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ان نظموں میں جدّت ضرور ہے لیکن ان میں فرار کا احساس ہوتا ہے اس لیے ان کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن مجھ پر ان نظموں کا گہرا اثر ہوا۔ میں نے انہیں دلچسپی سے پڑھا۔ تنہائی میں گنگنایا، احباب سے ان کی خوبیوں پر گفتگو کی۔ ترقی پسند مخالفین کی رائے کو ان کی جذباتیت پر محمول کیا۔ اور ادبی محفلوں میں اس موضوع پر خاصے تنقیدی ہنگامے کئے۔

فیض کی ان رومانی نظموں کو ابھی میں مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا اور ان میں سے بیشتر مجھے ازبر ہو چکی تھیں کہ ان کی نظمیں "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"۔ چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز اور "رقیب سے" شائع ہوئیں۔ ان نظموں میں زندگی

کا جو نیا شعور اور اس شعور کے ابلاغ میں جو نیا رنگ و آہنگ تھا اس نے بہت ہی لُطف دیا۔ اور اب وہ جذباتی قسم کے ترقی پسند بھی فیض کے قائل ہو گئے جو اس سے قبل ان کی رومانی نظموں کے خلاف تھے — اب انہیں فیض کی نظموں میں رومان و حقیقت کا سنگم نظر آیا اور وہ بھی ان کو اعلےٰ درجے کا شاعر ماننے، ان کی نظموں کو سراہنے اور ان کی غزلوں پر سر دھننے کے لیے مجبور ہوئے۔

ابھی ان نظموں کو رسالوں میں شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کی کتاب "نقشِ فریادی" چھپ کر آ گئی۔ اور اس مختصر سی کتاب نے ادبی حلقوں میں ایک دھوم مچا دی۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ خریدا اور اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل تھیں ان کو بار بار پڑھا۔ یہاں تک کہ تقریباً تمام نظمیں مجھے زبانی یاد ہو گئیں۔ ان نظموں میں رومانیت اور حقیقت کی جو دھوپ یا چھاؤں تھی اس نے مجھے اس طرح محسوس کرنے پر مجبور کیا جیسے ان میں ہماری ہی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ دراصل ان نظموں کی سب سے اہم خصوصیت یہی یہ تھی کہ وہ اس زمانے کے نوجوان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی پوری طرح عکاسی کرتی تھیں۔ وہ نوجوان جو رومان و حقیقت کے سنگم پر کھڑا تھا۔ جس کو اپنی روایت سے رومانیت اور جذبات پسندی ملی تھی۔ لیکن جس کو نئی زندگی کے احساس و شعور نے حقیقت پسندی کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ اسی لیے ہر نوجوان کو نقشِ فریادی کی نظموں میں ایک طرح کا آفاقی آہنگ نظر آتا تھا اور اس میں اپنے ہی جذبات و احساسات کی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج تقریباً تیس چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی جب مجھے "نقشِ فریادی" کی اشاعت کا وہ دور یاد آتا ہے تو یہ مصرعے میرے ذہن کی پہنائیوں میں ایک دفعہ پھر گونجنے لگتے ہیں اور میں انہیں گنگنانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں ؎

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے

اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے

زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

دو گھڑی اور ہے بہار شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنالیں ہم

آ محبت کے گیت گالیں ہم

○

سو رہی ہے گھنے درختوں پر — چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

کہکشاں نیم وا نگاہوں سے — کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز

سازِ دل کے خموش تاروں سے

چھن رہا ہے خمار کیف آگیں — آرزو، خواب، تیرا روئے حسین

○

رتہ بخوم کہیں چاندنی کے دامن میں — ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی

○

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار

ان مصرعوں میں عنفوان شباب کے مخصوص جذبات کا جوار تعاش ہے وہ آج بھی اسی طرح اثر کرتا ہے۔ جیسے آج سے برسوں پہلے کیا کرتا تھا آج بھی ان کو پڑھ کر اور گنگنا کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے حد نظر تک مسحور کر دینے والی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور زندگی نے اس چاندنی میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح غرق کر دیا ہے کہ دور دور تک اس کو کچھ اور نظر ہی نہیں آتا —— زندگی کے یہ لمحے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔ وقت کا دھارا انہیں بہا کر نہ جانے کہاں لے جاتا ہے۔ لیکن یادوں کا روپ اختیار کر کے وہ پھر بھی زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ابھی نقش فریادی کو شائع ہوئے کوئی سال بھر ہی ہوا تھا کہ فیض ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ آئے اور اس طرح انہیں دیکھنے اور پھر ان سے ملنے کا مجھے موقع ملا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ مشاعرہ کن لوگوں نے کیا تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ اس میں پرانے شعراء کے علاوہ نئے اور جدت پسند شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اور یہ خبر سن کر کہ فیض بھی اس میں شریک ہو رہے ہیں میں بھی اس میں گیا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما میموریل ہال میں مشاعرے کی یہ محفل ترتیب دی گئی تھی۔ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ بڑی ہی خوشگوار خنکی تھی رات کو آٹھ بجے کے قریب مشاعرہ شروع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مرادآبادی، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی اور فیض اس محفل میں موجود تھے مشاعرہ شروع ہوا مختلف شعراء اپنا کلام سناتے رہے۔ جب صدر نے فیض سے کلام سنانے کی درخواست کی تو ایک صاحب سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک طرف سے اٹھ کر اسٹیج پر آئے اور انہوں نے صدر کی اجازت سے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا اس زمانے میں ترنم سے پڑھنے کا بڑا زور تھا۔ جگر صاحب نے اپنے دلآویز ترنم سے مشاعروں کی فضا میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی ان کے علاوہ اس وقت کے نظم گو شعراء تک ترنم سے پڑھتے تھے

حفیظ، ساغر، روش، احسان دانش سب نے اپنے ترنم سے مشاعروں کی فضا کو رنگین اور پُرکار بنا رکھا تھا۔ لیکن بعض نوجوان شعرا تحت اللفظ بھی پڑھتے تھے۔ فیض نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھا۔ لیکن سامعین ان کے معنی خیز کلام اور پڑھنے کے مخصوص معصومانہ انداز سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایسی داد ملی کہ سماں بندھ گیا۔ فیض کا کلام تو اس زمانے میں خاصا مشہور تھا۔ آج ان کی زبان سے اُن کے کلام کو سُن کر لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ مجھے بھی ایمان کی بات ہے کہ ان کے کلام اور پڑھنے کے انداز دونوں نے بہت لطف دیا۔

مشاعرے کے بعد وہ چند روز لکھنؤ میں اور ٹھہرے اور ان دِنوں میں مجھے ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ملاقات تو اس کو نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ میں بغیر کسی تعارف کے خود کسی سے ملنے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے کھلتا ہوں اس وقت بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت فیض سے کہاں اور کس کے مکان پر ملاقاتیں ہوئیں۔

بہر حال اتنا یاد ہے کہ ہم چند طالب علم اپنے چند شاعر قسم کے احباب کے ساتھ فیض سے ملنے کے لیے گئے تھے اور ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی یاد ہے کہ فیض بولتے بہت کم تھے۔ میرے نوجوان ساتھیوں میں بعض بڑے تیز اور چرب زبان لوگ تھے انہوں نے فیض سے ہر پہلو سے بات کرنے کی کوشش کی۔ خدا جانے کتنے سوال پوچھ ڈالے لیکن جواب ہوں، ہاں، کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ خاصی دیر تک باتیں کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ فیض کا وطن سیالکوٹ ہے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی ہے۔ شاعری بچپن سے کر رہے ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کی فضاؤں میں ان کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ آج کل ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی زبان اور ادب پڑھاتے ہیں۔ شعر کہنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرتے جب کوئی جذباتی تجربہ شعر کے سانچے میں ڈھلنا چاہتا

ہے تو اس کو ڈھال دیتے ہیں۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر ہیں لیکن روایت سے کسی حال میں بھی رشتہ نہیں توڑنا چاہتے ـــــــ یہ تمام باتیں فیض نے خود نہیں کہیں۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے مختلف سوال کر کے یہ معلومات فراہم کی۔ لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوال طویل تھے لیکن فیض نے جو جواب دیئے ان میں حد درجہ اختصار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ باتیں کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔

میں نے اس ملاقات میں یہ بھی محسوس کیا کہ فیض نہایت شرمیلے آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ باتیں نہیں کرتے۔ شاید کر بھی نہیں سکتے۔ طولانی سوالوں کا جواب صرف ہوں، ہاں، سے دیتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں گفتگو تو انہیں ذرا بھی پسند نہیں۔ تعلّی سے تو وہ دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ برخلاف اس کے ان کے مزاج میں مجھے عجز و انکسار کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً انہیں اپنی شاعری کے بارے میں غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے زندگی اور ادب میں کوئی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ وہ تو بس اس لیے شعر کہتے اور شاعری کرتے ہیں کہ ان کا جی چاہتا ہے اور کوئی نامعلوم سی خلش نہیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے

فیض سے اگرچہ میری یہ ملاقات مختصر تھی لیکن اس ملاقات نے مجھے بہت لطف دیا۔ کیونکہ آج مجھے ایک ایسے شاعر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کی شاعری کو میں نے مزے لے لے کر پڑھا تھا۔ اور جس میں مجھے انسانی جذبات و احساسات کے نشیب و فراز اور سماجی زندگی کے مدّو جزر کی ایک واضح تصویر نظر آئی تھی۔

اس ملاقات کے دوسرے ہی دن فیض امرتسر واپس چلے گئے۔

اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستان میں ایک ہنگامہ تھا۔ برطانوی حکومت یہ کہتی تھی کہ یہ جنگ امن اور انسانیت کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ ہندوستان

کے لیڈروں کو اس سے اختلاف تھا۔ بڑے بڑے رہنما جیل میں تھے۔ اسی زمانے میں اشتراکیوں اور ترقی پسندوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ واقعی امن اور انسانیت کی جنگ ہے۔ چنانچہ بہت سے اشتراکی اور ترقی پسند ادیب تو رہا کر دیئے گئے۔ لیکن دوسرے سیاسی لیڈر جیلوں میں رہے۔ عجیب الجھن اور کشمکش کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کو اس جنگ سے زیادہ اپنی جنگ آزادی سے دلچسپی تھی۔ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس جنگ کو جیتنے کے لیے برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستان کی دولت پانی کی طرح بہاتی جا رہی ہے۔ بلکہ ان کے سپوت بھی صرف چند سکوں کے عوض جنگ کے مختلف میدانوں کو اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ اس احساس نے نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت کی ایک آگ سی بھڑکا دی تھی اور وہ بپھرے ہوئے تھے۔

اسی زمانے میں یہ خبر آئی کہ فیض نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر فوجی ملازمت کر لی ہے اب وہ لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض ہو گئے ہیں اور دلی میں ان کا تقرر محکمہ تعلقات عامہ کے اس شعبے میں ہوا ہے جس کو برطانوی حکومت نے جنگ کی پبلسٹی اور پروپیگنڈے کے لئے قائم کیا ہے۔

یہ خبر سن کر ادیبوں اور دانشوروں کو افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا اس خیال سے کہ فیض کے ایسے حساس اور لطیف مزاج رکھنے والے شاعر کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مہینوں اس پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ ترقی پسندوں نے اس کو سراہا۔ اس لیے کہ اس جنگ میں روس بھی شامل تھا اور ان کے لیے یہ جنگ امن اور انسانیت کی جنگ ہو گئی تھی ــــ لیکن میں اس خیال سے مطابقت پیدا نہ کر سکا اور فیض کی یہ فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان مجبور ہوتا ہے۔ جنگ نے حالات خراب کر دیئے ہیں معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے، جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ زیست دشوار

ہے۔ یونیورسٹی اور کالج کی ملازمت میں کیا ملتا ہے۔ حالات نے فیض کو مجبور کر دیا ہوگا۔
اسی زمانے میں مجاز نے ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اپنی وہ نظم پڑھی جس کا مصرع تھا۔

کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں

اور جس کی وجہ سے ایک زمانے تک ریڈیو میں اُن کا داخلہ بند رہا — دراصل اس میں فیض کی اس ملازمت ہی کی طرف اشارہ تھا اور مجاز کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف کسی عام مشاعرے میں بلکہ ریڈیو کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی۔ اور اس پر خاصے عرصے تک ہنگامہ ہوتا رہا۔

فیض کئی سال دلی میں رہے۔ اسی زمانے میں میرا تقرر بھی اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دہلی میں ہوگیا۔ دلی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اس زمانے میں لاہور کے بھی بہت سے ادیب اور شاعر دلی میں قیام پذیر تھے۔ بخاری صاحب (پطرس)، تاثیر، مولانا حامد علی خاں، حمید احمد خاں صاحب، حفیظ صاحب، فیض، راشد، میراجی، مختار صدیقی، اعجاز بٹالوی، ضیا جالندھری، اتفاق سے یہ سب لوگ اس وقت بہ سلسلۂ ملازمت دلی میں جمع تھے۔ اور ان کی وجہ سے جدید ادب کا خاصا چرچا تھا۔ اس زمانے میں نوجوان ادیب حلقۂ ارباب ذوق کے جلسوں میں ہر اتوار کو مل بیٹھتے تھے۔ شروع شروع میں یہ جلسے میں نے میراجی مرحوم کی فرمائش پر اینگلو عربک کالج ہال کے اسٹیج پر ترتیب دیئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کالج کے ارباب اختیار کو اس پر کچھ اعتراض ہوا تو یہ جلسے کالج ہی میں میری جائے قیام پر ہونے لگے۔ راشد اور تاثیر تو ان جلسوں میں آتے تھے لیکن فیض ان جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی سرکاری مصروفیت تھی۔ لیکن اس زمانے میں بخاری صاحب اور تاثیر صاحب نے بھی ایک حلقۂ احباب قائم کر رکھا تھا تو اس کے جلسے بھی کبھی بخاری صاحب یا تاثیر صاحب کے مکان پر یا

پالی ٹکنیک کی عمارت میں ہوتے تھے۔ تاثیر صاحب مجھے اکثر ان جلسوں میں شریک کرتے تھے۔ یہاں کبھی کبھی فیض بھی آتے تھے اور دلی میں انہیں جلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان جلسوں میں بھی میں نے یہی دیکھا کہ فیض بولتے بہت کم ہیں۔ بخاری صاحب اور تاثیر صاحب تو باغ و بہار قسم کے لوگ تھے اور اپنی باتوں سے گل و گلزار کھلاتے تھے۔ لیکن فیض نے ان جلسوں میں بھی کبھی دو ایک جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ ان کی اس کم سخنی ہی نے مجھے ان سے دور رکھا اور میں کبھی اس زمانے میں ان سے کھل کر باتیں نہ کر سکا۔ تاثیر صاحب سے مجھ سے خاصی بے تکلفی تھی اور وہ گھنٹوں مجھ سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے دفتر میں اولڈ سکریٹریٹ بھی چلا جاتا تھا اور وہ سرکاری کام کو چھوڑ کر علمی ادبی باتیں شروع کر دیتے تھے۔ لیکن فیض کے ساتھ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی کم سخنی ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہی۔ میرے مزاج کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ذرا مشکل سے کھلتا ہوں۔ چنانچہ اسی مزاج نے مجھے اس زمانے میں فیض کے ساتھ بے تکلف نہیں ہونے دیا۔ ان سے ملنے اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے کی آرزو ہمیشہ دل ہی میں رہی لیکن اس آرزو کی تکمیل سے ہم کنار ہونے کا موقع ذرا کم ہی ملا۔

چند سال اسی طرح گزرے۔ اس زمانے میں پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور قیام پاکستان سے بہت پہلے لوگوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام میں راہ کا روڑا نہیں بن سکتی۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والے لوگوں نے اسی زمانے میں پاکستان کے لیے مختلف قسم کی تیاریاں شروع کر دی تھیں ان میں پاکستان کے لیے نئے اخباروں کو جاری کرنے کا خیال بھی تھا۔ میاں افتخار الدین مرحوم نے اس سلسلے میں سب سے پہلے اقدام کیا اور لاہور سے پاکستان ٹائمز اور امروز نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ چند سال میں اس منصوبے نے عملی شکل اختیار کی اور لاہور سے یہ دونوں اخبار نہایت آب

دتاب سے نکلے۔ فیض پہلے پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر اور پھر اس ادارے سے شائع ہونے والے تمام اخباروں کے چیف اڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوجی ملازمت چھوڑ دی، صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور اس میدان میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ان کی ادارت کے زمانے میں ان اخباروں کا معیار اتنا بلند ہوا کہ یہ اخبار اس وقت کے چوٹی کے اخباروں میں شمار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس میں فیض کی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے جب میں قیام پاکستان کے بعد لٹ پٹ کر دتی سے لاہور پہنچا۔ صحافت کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہوتی ہے میں بھی شروع شروع لاہور میں بری طرح مصروف رہا۔ اس لیے فیض سے صرف چند مختصر ملاقاتیں ہوئیں کبھی کسی جلسے میں مل گئے کبھی کہیں کھانے یا چائے پر سرسری سی ملاقات ہوگئی۔ کبھی اطمینان سے بیٹھ کر تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس زمانے میں جب میں پنجاب یونیورسٹی کی انجمن اردو کا صدر مقرر ہوا تو فیض سے مفصل ملاقاتوں کے کئی مواقع ملے۔ اور ان ملاقاتوں سے زندگی کے متعلق ان کے خیالات اور ادب کے بارے میں ان کے نظریات کا اندازہ ہوا۔

انجمن کے زیر اہتمام میں نے کچھ ایسے جلسے ترتیب دیئے جن میں مشہور شعراء اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے اس سلسلے میں میں نے فیض کو بھی دعوت دی اور انہوں نے اس دعوت کو اپنی مصروفیت کے باوجود بخوشی قبول کیا۔ جلسے میں آئے۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تقریر کی اور تاریخی ترتیب سے اپنی نظمیں سنائیں۔ جلسے کے آخر میں استادوں، طالب علموں اور ادیبوں نے بعض سوالات بھی کئے اور فیض نے ان کے جواب بھی دیئے۔

فیض نے اس جلسے میں بتایا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت ۷ جنوری ۱۹۱۱ء ہے ان کا بچپن سیالکوٹ ہی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں ہوئی۔ شمس العلماء مولوی میر حسن اور مولوی میر ابراہیم سیالکوٹی ان کے استاد تھے۔ ان

بزرگوں کا شکار اپنے زمانے کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شخصیتوں نے ان پر گہرے اثرات چھوڑے اور شاعری کا آغاز اسکول ہی کے زمانے سے ہوا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھیں انعامات ملے۔ اس زمانے میں اسکول سے باہر بھی سیالکوٹ میں شعروشاعری کے چرچے تھے۔ چنانچہ ان مشاعروں میں بھی شرکت کی، اور اپنے اشعار پڑھ کر داد حاصل کرتے رہے۔ میٹرک پاس کرکے تعلیم کی غرض سے لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ بخاری صاحب، تاثیر صاحب اور صوفی تبسم صاحب کے زیر اثر آئے اور اس زمانے میں انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اسی زمانے میں انہیں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور ان تحریکوں کے زیر اثر ان کی شاعری کو زندگی کے نئے شعور سے آشنا ہونے کا موقع ملا چنانچہ آج بھی یہ اثرات، ان کی شاعری میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتے ہیں ——— وغیرہ وغیرہ

اس مختصر سی تقریر کے بعد فیض نے اپنی مختلف نظمیں تاریخی ترتیب سے سنائیں اور اختصار کے ساتھ ان کا پس منظر بھی بیان کیا۔ اس جلسے میں بعض لوگوں نے فیض سے ان کی مختلف نظموں کے بارے میں سوالات بھی کئے اور فیض نے ان کے جوابات بھی دیئے کئی گھنٹے کی اس دلچسپ صحبت نے فیض کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو ہم لوگوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ آج مجھے ایک بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ فیض کو دوسرے شاعروں کی طرح اپنے کلام کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں تعلّی سے کام نہیں لیتے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی شاعری کے نشیب و فراز کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس کے ایک باشعور نقاد بھی ہیں ——— فیض نے انجمن اردو میں خاصی دلچسپی لی اور اس کے جلسوں میں اپنی مصروفیتوں کے باوجود پابندی سے شریک ہوتے رہے اس زمانے میں مجھے فیض کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اور ان کے خیالات و نظریات سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں ایک دن مجھے وہ خبر ملی جس کو سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ اور وہ خبر یہ تھی کہ فیض کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

سہ پہر کا وقت تھا میں مال روڈ پر باغ جناح کی طرف سیر کی غرض سے جا رہا تھا کہ راستے میں اخبار والے کی آواز سنائی دی جو کسی اخبار کا ضمیمہ بیچ رہا تھا۔ اور اس کی یہ آوازیں فضاؤں میں گونج رہی تھیں — "باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا —— سازش ناکام ہو گئی —"

میں نے اس سے اخبار کا ضمیمہ لیا اور باغ جناح میں جا کر اس کو پڑھا۔ اس میں فیض کی گرفتاری کی خبر بھی تھی۔ اس خبر کو پڑھ کر طبیعت بہت بدمزہ ہوئی۔ رات بھر پریشان رہا۔ نیند نہیں آئی۔ بے شمار خیالات آتے رہے۔

صبح کو یہ خبر ملی کہ لوگ گرفتار ہوئے ہیں ان پر مقدمہ چلایا جائے گا لیکن اس کی کارروائی پوشیدہ رہے گی۔ چنانچہ مقدمہ چلایا گیا لیکن اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا سب کو سزائیں ہوئیں۔ فیض اس طرح کئی سال جیل میں رہے۔

جیل میں ان پر کیا بیتی اس کا تو مجھے علم نہیں کیونکہ میں نے اس تلخ موضوع پر کبھی ان سے بات نہیں کی۔ البتہ اس زمانے میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں اور جو چھپ کر سامنے آتی رہیں۔ ان کو پڑھتا رہا۔ حکومت کی طرف سے ان کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی بلکہ ان کا دوسرا مجموعہ "دستِ صبا" اسی زمانے میں چھپ کر سامنے آیا جب وہ جیل میں تھے۔

یہ مجموعہ مکتبہ کارواں لاہور کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا اس کے ناشر چودھری عبدالحمید صاحب نے لاہور کے ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں لاہور کے تمام ادیبوں شاعروں فنکاروں اور استادوں کو جمع کیا تھا۔ اور دستِ صبا کے نسخے تقسیم کئے تھے۔ ان تمام نسخوں پر فیض نے جیل سے "محبت سے" کے الفاظ لکھ کر بھیجے تھے اور نیچے اپنے دستخط بھی کئے تھے۔

اس مجموعے کو میں نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اور اس پر ایک مفصل مضمون

بھی لکھا۔ جو اخبار امروز لاہور کے استقلال نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں نقش فریادی کی سی بات نہیں تھی لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ فیض کی شاعری کے جس دھارے کو صحافت نے وقتی طور پر روک رکھا تھا وہ اب نئے حالات کے زیر اثر ایک دفعہ پھر بہہ نکلا ہے۔ اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل تھیں ان میں جذبات کی گرمی اور شعور کی روشنی کچھ اور بھی نمایاں تھی اور کہیں کہیں تھوڑی سی تلخی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان میں آس پاس اور گردوپیش کی زندگی کے مخصوص حالات کے مدّوجزر کی ایک تصویر بہر صورت موجود تھی۔ اور باشعور نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا مخصوص نغمہ بہر حال سنائی دیتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس کو نقشِ فریادی سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فیض کے ساتھ دلچسپی اس زمانے میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے شیدائی ہو گئے۔ اُن کی شاعری نے انہیں لوگوں کی نظروں میں مقبول اور محبوب بنا دیا تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء تو ان کے دل و جان سے شیدائی تھے۔ وہ ایک سنگین الزام میں گرفتار تھے لیکن اس زمانے میں کالجوں میں جو مشاعرے ہوتے تھے وہاں فیض کی غزلوں پر غزلیں کہی جاتی تھیں مشاعروں میں شریک ہونے والے شاعر اشاروں اور کنایوں میں ان کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

اس صورت حال نے بعض ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں اس خیال کی لہر پیدا کی کہ فیض کی رہائی کے لیے حکومت سے مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک درخواست لکھی گئی، ادیبوں، شاعروں، یونیورسٹی اور کالج کے استادوں نے اس پر دستخط کئے اور وہ حکومت کو بھیجی گئی خدا جانے اس کا کوئی اثر ہوا یا نہیں کیونکہ مقدمہ عدالت میں تھا۔ لیکن مقدمے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد فیض رہا کر دیئے گئے۔ ان کے رہا ہونے سے جو خوشی ادیبوں اور شاعروں کو ہوئی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

لاہور میں ان کے مکان پر آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور کئی ہفتے تک میلہ سا لگا رہا۔ میں بھی بعض احباب کے ساتھ ان کی خیریت معلوم کرنے مزاج پوچھنے اور مبارک باد دینے کے لیے ایک شام ان کی جائے قیام پر پہنچا۔ عرصے کے بعد فیض سے ملاقات ہوئی دیکھ کر دل بھر آیا۔ معانقہ کیا۔ حال احوال پوچھا۔ چائے آگئی۔ باتیں ہوتی رہیں۔

جیل کی زندگی کے بارے میں میں نے جان کر کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا دریافت کیا "جیل میں آپ کو پڑھنے لکھنے کی آسانیاں فراہم کی گئی ہوں گی؟"

کہنے لگے "جی ہاں! پڑھنے لکھنے کی کوئی دشواری نہیں تھی"۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے جیل میں پچھلے دنوں کون کون سی کتابیں پڑھیں؟"

کہنے لگے "سودا کے کلام کا مطالعہ کیا۔ اور اس کو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ چنانچہ سودا کی زمینوں میں کچھ غزلیں کہیں"۔

میں نے کہا وہی غزلیں جو نذر سودا، کے عنوان سے آپ کے نئے مجموعے میں شائع ہوئی ہیں"۔

بولے "جی ہاں"۔

اس کے بعد وہ پوچھنے لگے "کہیے، اورینٹل کالج کا کیا حال ہے؟ ارباب اختیار اور احباب کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہے۔ کام چل رہا ہے"۔

اور اس کے بعد دیر تک ہم لوگ سودا کی شاعری اور اورینٹل کالج کے معاملات پر باتیں کرتے رہے کوئی ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد میں نے رخصت ہوتے ہوئے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

کہنے لگے "کوئی ارادہ نہیں۔ آرام کروں گا۔ تھک گیا ہوں"۔

اور واقعی فیض کی آواز میں تھکن کے آثار تھے۔ بظاہر تو صحت اچھی معلوم ہو رہی

تھی لیکن کچھ بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے جیسے گذشتہ چند سال کے قید و بند نے انہیں ہلکان کر دیا ہو۔

کئی سال گزر گئے۔

اور پھر مجھے ۵۶ء میں فیض کے ساتھ ایک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔

دلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس تھی اس میں شرکت کے لیے پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد بھی گیا تھا۔ اس وفد میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، شوکت تھانوی مرحوم، اعجاز بٹالوی اور قتیل شفائی شامل تھے۔

ہم سب لوگ صبح کو لاہور میں فیض کی جائے قیام پر جمع ہوئے اور واہگہ کے راستے سے امرتسر پہنچے۔ دن امرتسر میں گذارا۔ میں نے اس سے قبل امرتسر نہیں دیکھا تھا۔ فیض مجھے امرتسر کے تنگ اور تاریک بازاروں میں لے گئے۔ جلیاں والا باغ دکھایا۔ دربار صاحب اور ہال بازار کی سیر کرائی۔ مرحوم ایم۔اے۔او کالج کی عمارت میں لے گئے اور یہ بتایا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہاں تاثیر صاحب لکچر دیتے تھے۔ پھر سول لائنز کے مختلف مکانوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بتاتے رہے کہ میں یہاں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس جگہ ہم نے اپنی زندگی کے بہترین دن گذارے تھے۔

اس طرح دن بھر فیض مجھے امرتسر کی سیر کراتے رہے۔ شام کو سول لائنز میں ایک ہندو دوست کے یہاں کھانا کھایا اور رات کو ہم لوگ فرنٹیر میل سے دلی روانہ ہوئے۔

صبح کو دلی پہنچے۔ اسٹیشن پر ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے والنٹیر اور کچھ ادیب موجود تھے۔ ان لوگوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہار پہنائے اور نئی دلی میں ہماری جائے قیام پر پہنچا یا۔

پانچ چھ روز ہم لوگ دلی میں رہے۔ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ان سب میں ہم لوگوں نے شرکت کی فیض نے ان جلسوں میں دو تقریریں کیں۔ ایک تو پاکستان

میں ادیب کی حیثیت کے بارے میں اور دوسری پاکستان کے جدید ادب کے متعلق۔ ان تقریروں سے یہ اندازہ ہوا کہ انہوں نے پاکستانی ادیبوں کے مسائل اور پاکستانی ادب کے جدید رجحانات کا تجزیاتی زاویہ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ ان کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔

کانفرنس کے بعد ایک مشاعرہ بھی ہوا اس میں فیض نے بھی اپنی نظمیں سنائیں اور انہیں ایسی داد ملی کہ بیشتر شاعروں کو اس پر رشک آیا۔ ہر طرف بس فیض ہی فیض نظر آتے تھے۔

پاکستان سے باہر فیض کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ پاکستان ہی میں لوگ فیض کے شیدائی ہیں لیکن اب یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پاکستان سے باہر بھی انہوں نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی ہے اور یہ مرتبہ کسی شاعر کو ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

اس مقبولیت کا سبب انسانیت اور انسان دوستی کا وہ پیام ہے جس کے گرد اُن کی شاعری گھومتی ہے۔ اور اسی پیام نے انہیں کئی سال بعد لینن پرائز دلایا جو بلا شبہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

فیض لینن پرائز لینے کے لیے روس گئے اور وہاں سے واپس آکر کوئی ڈیڑھ سال لندن میں رہے۔ میں بھی کم و بیش اسی زمانہ میں اردو کے استاد کی حیثیت سے لندن آیا اور یہاں ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

بی بی سی میں صلائے عام کے کئی پروگرام ایسے ہوئے۔ جس میں ہم نے پاکستان کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا. مشاعرے بھی ترتیب دیئے گئے۔ جس میں فیض نے اپنا کلام سُنایا اور بعض ادبی جلسے بھی ایسے ہوئے جن میں کبھی کبھی فیض نے تقریریں کیں اور اس طرح مجھے لندن میں فیض کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات و نظریات سے اچھی طرح آشنا ہونے کے مواقع ملے۔

لندن میں فیض کبھی کبھی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز آجاتے تھے اور میرے ساتھ سینیئر کامن روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ میرے دوست اور رفیق کار رالف رسل بھی ان باتوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتے تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ مختلف ممالک میں ان کے سفر کی روداد سنی جاتی تھی اور اردو زبان اور ادب کو پھیلانے کے منصوبے بنائے جاتے۔

لندن کے دوران قیام میں فیض نے پاکستان کی ثقافت پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ میرے ساتھ وہ کئی بار برٹش میوزیم بھی گئے لیکن ان کے پاؤں میں چکر رہا اس لیے وہ دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ کام نہ کر سکے۔

اور پھر ایک دن فیض اسکول آئے میرے ساتھ سینئر ریفکٹری میں دن کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ سینئر کامن روم میں کافی پینے گئے۔ وہاں انھوں نے یہ خبر سنائی کہ وہ جلد پاکستان جا رہے ہیں۔

میں نے پوچھا "اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"
کہنے لگے "بس یہاں جی نہیں لگتا۔ طبیعت اکتا گئی ہے"۔
میں نے کہا "عجیب بات ہے کہ لندن میں آپ کا جی نہیں لگتا"۔
کہنے لگے "اپنا وطن یاد آتا ہے۔ ایک ایک چیز کی یاد ستاتی ہے۔ یہاں کس سے ملوں؟ کس سے باتیں کروں؟ کس کے لیے شعر کہوں؟ کس کو شعر سناؤں؟"
میں خاموش سنتا رہا۔
رسل کہنے لگے "لیکن یہاں آپ کو آزادی زیادہ ہے اور کام کرنے کے مواقع بہت ہیں"۔
فیض نے کہا "پابندی تو مجھ پر اپنے وطن میں بھی کوئی نہیں ہے۔ میں وہاں بھی آزاد ہوں۔ کام البتہ یہاں مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں اجنبیت اتنی زیادہ ہے کہ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر سب سے خراب بات یہ ہے کہ یہاں کی زندگی تمام تر

مصنوعی ہے۔اس میں تصنع بہت ہے۔یہاں کسی سے ملنے جائیں تو پہلے وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔دوستوں تک سے ملنے کے لئے بھی یہاں پر فون پر وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ اپنے یہاں تو جس وقت جی چاہا اٹھے اور دوستوں کے یہاں چلے گئے۔ مل گئے تو گپ شپ ہوئی تھوڑا سا وقت اچھا گزر گیا۔نہیں ملے تو واپس چلے آئے۔یہاں اس کا کوئی تصور نہیں۔اسی لئے اس فضا میں میرا تو دم گھٹتا ہے۔

میں خاموش سنتا رہا۔

فیض نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

رالف کو مخاطب کر کے کہنے لگے —— صاحب، آپ لوگوں نے بہت ترقی کی ہے۔لیکن آپ لوگ ابھی تک ہیں بابا آدم کے زمانے میں۔یہاں ہر شخص کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔مہذب تو ہم لوگ ہیں کہ ہم نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا ہے۔ہر شخص کے لیے وہاں کام مقرر ہے۔اس طرح ہر شخص کو آسانی ہوتی ہے اور یہی زندگی کی زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے"۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مجھے ہنسی آگئی۔فیض بھی ہنسنے لگے۔رالف نے بھی حسب معمول قہقہہ لگایا اس دن دیر تک ہم لوگ اس قسم کی دلچسپ باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن فیض نے فون پر یہ اطلاع دی کہ وہ ۲۷ جنوری کو لاہور جا رہے ہیں۔ جہاز نیپلز سے جائے گا۔لندن سے نیپلز تک وہ ریل میں سفر کریں گے اور راستے میں دو دن پیرس میں ان کا قیام رہے گا۔

اس زمانے میں میں نے اسکول کے شعبۂ اردو کے لیے ادیبوں اور شاعروں کی آوازوں کو ریکارڈ کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔اور خاصی تعداد میں چیزیں ریکارڈ کی تھیں۔

جب فیض نے جانے کی تاریخ طے کر لی تو خیال ہوا کہ ان کا بھی ایک انٹرویو ریکارڈ کر لیا جائے۔چنانچہ لندن سے رخصت ہونے سے ایک روز قبل خاص طور پر انہیں اس

کام کے لیے اسکول میں دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا۔ وہ آئے میں نے ان سے ان کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے بارے میں مختلف سوالات کئے جس کے انہوں نے نہایت خوبصورت جواب دیئے۔ اور اس طرح ایک دلچسپ اور مفید چیز تیار ہو گئی جو اسکول آف اورینٹل اسٹیڈیز لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں محفوظ ہے اور اب افادیت کے پیش نظر اس مضمون کے ساتھ بھی اس کو شامل کیا جا رہا ہے۔

۲۳ر جنوری کو ان سے لندن میں میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ۲۴ر کو وہ لندن سے نیپلز روانہ ہوئے اور پھر یہ خبر ملی کہ فروری کی ۱۳ تاریخ کو وہ پاکستان پہنچے۔ ادیبوں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں بے شمار محفلیں منعقد ہوئیں اور وطن عزیز میں کراچی سے پشاور تک ایک دھوم مچ گئی۔

لندن میں انہوں نے رخصت ہونے سے قبل مجھے اپنی آخری غزل سنائی تھی اس کے یہ دو شعر مجھے بہت پسند آئے تھے اور میں نے اصرار کر کے انہیں بار بار اشعار پڑھ کر سنانے کی زحمت دی تھی۔ پھر بھی میرا دل نہیں بھرا تھا۔ کیسے عجیب شعر تھے۔

شرحِ فراق و مدحِ لبِ مشک بو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سبو کریں

۲

انگلستان کے دوران قیام میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے شعبۂ اُردو کے لئے گذشتہ سال میں نے اور میرے دوست اور رفیق کار رالف رسل نے اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں ایک روز

ہم نے فیض صاحب کو بھی مدعو کیا۔ ان دنوں وہ لندن میں بھی مقیم تھے۔ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا، اسکول آئے اور کئی گھنٹے ہمارے ساتھ گذارے۔ میں نے فیض صاحب سے اُن کی شخصیت اور شاعری پر چند سوال کئے اور انہوں نے ان کے مفصل جواب دیئے۔ ان سے فیض کی شخصیت اور شاعری پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور یہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی خیال سے میں نے اس کا مسوّدہ اشاعت کے لئے تیار کیا۔ یہ کام بہت دشوار تھا، لیکن میرے عزیز دوست اور رفیق کار رالف رسل کی مدد نے اس کو آسان کر دیا۔ کئی گھنٹے ہم لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کو بجا کر آواز سنی اور اس کا مسودہ تیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈ قلم کے مقابلے میں تیز ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو ٹیپ ریکارڈ سے مسودے تیار کرنے کا تجربہ ہے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کام میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور کس طرح لہو جلانا پڑتا ہے۔ رالف اس کام میں ہاتھ نہ بٹاتے تو اس کا تکمیل سے ہم کنار ہونا مشکل تھا۔

مجھے یقین ہے کہ فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری سے دلچسپی لینے والوں کے لئے لندن کی اس ملاقات کی تفصیل دلچسپی کا باعث ہوگی۔

(عبادت)

عبادت: فیض صاحب! آج میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں — آپ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں — سب سے پہلے تو آپ یہ فرمائیے کہ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی، اور وہ ماحول کیسا تھا جس میں آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گذارے؟

فیض: ولادت تو میری سیال کوٹ کی ہے۔ تاریخ ولادت مجھے خود نہیں معلوم۔ ایک ہم نے فرضی بنا رکھی ہے۔ لیکن ......

عبادت: اچھا وہی بتا دیجیے۔

فیض : ۷ / جنوری ۱۹۱۰ ء ہے۔ لیکن یہ محض اسکول کے سرٹیفکیٹ سے نقل کی گئی ہے۔ اور میں نے سُنا ہے کہ اس زمانے میں اسکول میں جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ سب جعلی ہوتی تھیں۔ (قہقہہ) اس لئے کہ وہ اس حساب سے لکھی جاتی تھیں کہ فلاں عمر میں آدمی میٹرک پاس کرے گا اس کے بعد انگریزی یا سرکاری نوکری کے لئے عمر کم ہونی چاہیئے ـــــ تو بچپن میرا سیالکوٹ ہی میں گذرا۔ اسکول میرا اسکاچ مشن اسکول تھا وہاں ـــــ اس کے ساتھ اصل میرے استاد جو تھے شمس العلماء مولوی میر حسن تھے۔ جن سے میں نے چھٹی یا ساتویں جماعت میں عربی کی صرف ونحو پڑھی۔ اور اُس سے زیادہ میرے اُستاد یعنی زیادہ قریبی اُستاد تھے۔ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی۔ بہت بڑے فاضل تھے۔ ابجد میں نے اُن سے پڑھی۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اُس کے بعد قرآن اور حدیث کا درس اُن سے لیا برسوں ـــــ تو بچپن تو وہیں پر گذرا۔ اس کے بعد ایف۔ اے تک میں نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔

عبادت: اچھا لاہور میں کون اساتذہ ایسے تھے جن سے آپ نے استفادہ کیا؟

فیض : لاہور میں مَیں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ وہاں پر ہمارے انگریزی کے اُستاد تھے ـــــ دو استاد تھے ـــــ اپنے زمانے میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ ایک پروفیسر لینگ ہارن (Langhorn) ایک پروفیسر فرتھ جو آج کل یہاں پر ہیں[1]۔ اور تیسرے ہمارے بخاری صاحب تھے۔ پطرس ـــــ اس کے علاوہ فلسفے میں پروفیسر چٹرجی تھے۔ عربی میں ڈاکٹر صدر الدین مرحوم تھے۔ اور اگرچہ میں فارسی کا

---

[1] پروفیسر فرتھ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹڈیز میں لسانیات کے پروفیسر تھے، لیکن چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔ (عبادت)

طالب علم نہیں تھا لیکن قاضی فضل حق صاحب سے مراسم تھے۔ اس لئے کہ وہ ہماری بزم سخن کے صدر بھی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اُن دنوں جو زیادہ معتبر اور بزرگ ادیب اور لکھنے والے تھے وہ بیشتر یک جا ہوا کرتے تھے ــــ یا تاثیر مرحوم کے گھر پر یا صوفی تبسّم صاحب کے یہاں ــــ یا بخاری صاحب کے یہاں ــــ تو زیادہ تعلیم تو میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے اندر نہیں ہوئی۔ کالج کے باہر ہوئی۔

عبادت: بے شک ــــ ان صحبتوں میں ــــ

فیض: جی ان لوگوں کی صحبتوں میں ــــ خاص طور پر پروفیسر بخاری صاحب کے یہاں تو باقاعدگی سے ہر مہینے ایک محفل ہوا کرتی تھی، جس کا نام انہوں نے "بزمِ اردو" رکھا تھا۔ جو آج کل "بزمِ احباب" کے نام سے جاری ہے ــــ اور صوفی صاحب کا دیوان خانہ تھا۔ وہاں پر تو ہمیشہ لوگ جمع رہتے تھے ــــ اور تیسرے تاثیر صاحب کا گھر تھا ــــ تو اس زمانے کے بیشتر بزرگوں سے انہیں لوگوں کے دولت کدوں پر ملاقات ہوئی۔

عبادت: اچھا فیض صاحب! یہ بتایئے کہ آپ نے شاعری کب شروع کی؟

فیض: یہ تو مجھے یاد ہے کہ تُک بندی کیسے شروع ہوئی۔ شاعری اس کے بعد کب سے شروع ہوئی وہ ذرا کہنا مشکل ہے۔ تُک بندی کا تو مجھے معلوم ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ لڑکوں کا ایک مقابلہ کرنا چاہیئے ــــ شعر سازی کا ــــ کہا گیا کہ مصرع طرح پر آپ سب لوگ طبع آزمائی کریں، تو انعام دیا جائے گا ــــ تو اس قسم کا پہلا جو مقابلہ ہوا اس کے منصف اور جج تھے شمس العلماء مولوی میر حسن صاحب ــــ پہلا جب اس قسم کا مقابلہ ہوا تو اتفاق سے ہمیں انعام مل گیا ــــ تو گویا کہ انعام سے زیادہ وہ تمغہ تھا کہ انہوں نے پسند کیا ــــ اور انعام مجھے یاد ہے ایک روپیہ ملا تھا۔

عبادت: بہت خوب!

فیض : اس سے کچھ تھوڑا سا ہمیں مغالطہ ہو گیا کہ شاید ہم کچھ کہہ سکتے ہیں ۔ اُس کے بعد میرے گھر کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ حویلی تھی اس پُرانے زمانے کی ۔۔۔ وہاں پر باقاعدگی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے شہر میں منشی راج نرائن ارمان دہلوی صاحب تھے۔ شاید آپ نے نام سُنا ہو۔ اس لئے کہ بعد میں وہ لاہور اُٹھ آئے تھے۔

عبادت: جی ہاں!

فیض : تو انہوں نے ایک محفل مشاعرہ قائم کر رکھی تھی ۔۔۔ ہمارے گھر کے بالکل ساتھ ۔۔۔ اس کے باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے ۔۔۔ اور ایک بزرگ ہوا کرتے تھے منشی سراج دین مرحوم جو کہ علامہ اقبالؒ کے دوستوں میں سے تھے۔ اور ان کا ذکر بھی ہے علامہ کی تحریروں میں ۔۔۔۔ تو وہ ہمیشہ صدارت کیا کرتے تھے ۔۔۔ وہ کشمیر میں میر منشی تھے ۔۔۔ تو مشاعرے اس طریقے سے ہوا کرتے تھے جب اُن کی ریذیڈنسی سیالکوٹ میں آجاتی تھی تو وہ بھی سیالکوٹ میں آجاتے تھے، اور ان کے ساتھ مشاعرہ بھی آجاتا تھا۔ تو پانچ چھ مہینے اس کا بازار گرم رہتا تھا ۔۔۔ وہاں پر ہم بھی جایا کرتے تھے ۔۔۔ مصرع طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں ۔۔۔ بہت دنوں تک تو خیر ہمیں ہمت نہیں ہوئی اس لیے کہ منشی سراج دین صاحب بڑے فقرے باز آدمی تھے۔

عبادت: خوب! (قہقہہ)

فیض : اور جب کوئی شعر سُنانے کے لئے آتا تو ایک شعر اس نے پڑھا اور انہوں نے دس شعر اساتذہ کے اُسی مضمون پر سُنا دیئے۔

عبادت : واقعی مشکل چیز تھی۔

فیض : تو بہت دنوں کے بعد ہمیں ہمت ہوئی، تو ہم نے ایک غزل پڑھ دی، اور خلاف

توقع منشی صاحب نے داد دی۔ کہا، "برخوردار یہ تو اچھا ہے۔" لیکن یہ سب تک بندی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں گیا ہوں تو فورتھ ایئر میں ـــــ تو جب سے تھوڑا بہت شعر کا، یعنی محض مشقِ سخن کے لیے نہیں ـــــ بلکہ ـــــ

عبادت: یعنی جی چاہتا تھا شعر کہنے کو۔

فیض: کچھ احوالِ دل بیان کرنے کے لیے ـــــ ضرورت پڑی ـــــ

عبادت: وہ تو آپ کی نظموں سے پتہ چلتا ہے۔

فیض: تو بس جب سے شاعری شروع ہوئی۔

عبادت: اچھا، اس زمانے کی وہی نظمیں ہیں جن میں رومانی رنگ و آہنگ ہے اور جو نقشِ فریادی، کے پہلے حصے میں شامل ہیں۔

فیض: جی ہاں! نقشِ فریادی، کی نظموں کا پہلا حصہ تو گورنمنٹ کالج ہی کے زمانے کا ہے۔

عبادت: یہ نظمیں آپ نے کب لکھیں؟

فیض: آپ یہ سمجھئے کہ سنہ ۲۹ء سنہ ۳۰ء کا زمانہ ہے۔

عبادت: اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک اگرچہ باقاعدہ تو نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن اُس کے شروع ہونے کے آثار موجود تھے، تو آپ کو ـــــ

فیض: ہاں، ترقی پسند تحریک اصل میں کوئی تین چار برس بعد شروع ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں کچھ کچھ قصہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن باقاعدگی سے سنہ ۳۳ء میں شروع ہوئی تھی۔

عبادت: ۳۵ء میں شروع ہوئی تھی۔

فیض: لیکن فضا میں آثار اس کے پیدا ہو گئے تھے۔ سنہ ۳۵ء میں جب میں نے کالج سے تعلیم ختم کر کے امرتسر میں پڑھانا شروع کر دیا تھا، ایم۔ اے او کالج میں ـــــ تو انہیں دنوں یہ تحریک شروع ہوئی ـــــ تو پھر اُس کے ساتھ ـــــ

عبادت: آپ کو کچھ رابطہ پیدا ہوا۔

فیض : جی ہاں، رابطہ پیدا ہوا۔

عبادت : اچھا، آپ نے جو یہ نظمیں لکھی ہیں، رقیب سے، چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز ــــ یہ اس اثر کے بعد کی ہیں ؟

فیض : اس کے بعد کی ــــ دراصل یہ اُس وقت لکھی گئیں جب تھوڑا بہت سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا ــــ یہ پہلی نظم تو ہے، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، ــــ اور یہ ساری نظمیں اُس کے بعد کی ہیں ــــ یہ ۳۵ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان کی ہیں۔

عبادت : اچھا فیض صاحب! یہ فرمایئے کہ کبھی علامہ اقبالؒ سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

فیض : جی ہاں اُن سے کئی دفعہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہم وطن تھے، دوسرے وہ میرے والد کے دوست بھی تھے۔ اس لئے کہ دونوں ہم عصر تھے ــــ اور یہاں انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ رہے تھے۔

عبادت : خوب!

فیض : چنانچہ اُن سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے۔ بہت بچپن میں ہوئی جب کہ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں پر ہمارے یہاں ایک انجمن اسلامیہ تھی۔ اُس کا ہر سال ہوا کرتا تھا جلسہ ــــ وہ اسکول بھی تھا، دو تین اسکول تھے ــــ تو وہاں پر کبھی کبھی علامہ اقبالؒ اُن کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔ تو پہلی دفعہ تو میں نے انہیں انجمن اسلامیہ کے جلسے میں دیکھا ــــ اور مجھ کو اس جلسے میں دیکھا ــــ اور مجھ کو اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لئے دیا گیا کہ میں اسکول میں پڑھتا تھا ــــ اسلامیہ اسکول میں ــــ قرأت کیلئے۔

عبادت : بہت خوب!

فیض : مجھے یاد ہے کہ کسی نے اُٹھا کر منبر کے سامنے کھڑا کر دیا تھا کہ پڑھے۔

عبادت : چنانچہ آپ نے کلام پاک کی تلاوت کی ؟

فیض : جی ہاں! اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے گیا تو علامہ ہی سے خط لے کے گیا تھا۔ قاضی فضل حق صاحب کے لیئے۔

عبادت: اچھا خوب!

فیض : اور اس کا مجھے افسوس ہے کہ وہ خط قاضی صاحب نے ہتھیا لیا۔ جب انٹرویو ختم ہو گیا تو میں نے کہا وہ خط مجھے دے دیجئے۔ انہوں نے کہا۔ 'نہیں یہ تو میرے پاس رہے گا'۔

عبادت: اہم چیز تھی۔ کاش آپ کو وہ خط واپس مل جاتا! خدا جانے کہاں ضائع ہو گیا ہوگا۔

فیض : جی ہاں —— اور پھر کالج سے نکلنے کے بعد سچی بات ہے کیونکہ وہ ایک اتنے بڑے بزرگ شاعر تھے، اور دوسرے چونکہ ہمارے والد کے دوست تھے اس لئے ہمیں تو جانے میں کچھ جھجک ہوتی تھی۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد ایک دفعہ تو مجھے یاد ہے، جب وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کر کے آئے تھے۔ لندن سے واپس لوٹے تھے تو ہم نے گورنمنٹ کالج کی طرف سے اور بہت سی انجمنوں کی طرف سے ایک مشترکہ استقبالیہ دیا تھا......

عبادت: علامہ کے اعزاز میں۔

فیض : جی ہاں! —— تو اسی زمانے میں —— یہ ہماری طالب علمی کے آخری دن تھے —— گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں پھر ایک مقابلہ ہوا تھا —— شعر اور اُس کا موضوع تھا اقبالؒ!

عبادت: بہت خوب!

فیض : اُس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا —— تو اُس پر صوفی صاحب[1] نے کہا تھا "نظم سُنا دو

---

[1] پروفیسر صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسّم

تو ہم نے کہا کہ "بھئی علامہ کے سامنے تو ہم نظم نہیں سناتے"۔ انہوں نے کہا "نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ بہت اچھی ہے۔ پڑھ دو"— خیر وہ ہم نے پڑھ دی۔

عبادت: اچھا۔

فیض: اس کے بعد پھر تاثیر صاحب، صوفی صاحب، سالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔

عبادت: اچھا فیض صاحب! ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اُردو شاعروں میں سے آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے، اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں؟

فیض: صاحب! اصل میں اگر مطالعہ آپ سمجھیں تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے — یعنی غالب کا — اس کے بعد جیل خانے میں سودا کے ساتھ کچھ وقت گذارا۔ — اور کچھ نظیر کا کلام بھی پڑھا۔

عبادت: ظاہر ہے کہ یہ تو اہم شاعر ہیں۔

فیض: یوں تو اپنی مدرسی کے زمانے میں — اور پھر ریڈیو وغیرہ کے سلسلے میں تو مجبوراً سب ہی کو پڑھنا پڑا۔ لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھا ہے اُن میں یہی ہیں۔ میر، غالب، سودا، نظیر، انیس

عبادت: اچھا فیض صاحب! جدید شاعروں میں سے آپ کس کو پسند کرتے ہیں؟ جدید شاعروں سے میرا مطلب ہے وہ شاعر جو علامہ اقبالؒ کے بعد آئے اور آپ کے ہم عصر ہیں۔

فیض: صاحب! اپنے ہم عصروں میں اگر میں کہوں کہ مجھے فلاں پسند ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ باقی پسند نہیں ہیں۔

عبادت: نہیں نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو کون سے ہم عصروں سے نسبتاً زیادہ مناسبت ہے۔

فیض : مجھے تو سب لوگ پسند ہیں۔ لیکن زیادہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک تو راشد۔

عبادت : ن۔م۔راشد۔

فیض : بالکل ـــــ دوسرے ایک مجاز مرحوم تھے اور مخدوم ہیں۔ علی سردار ہیں۔ تو ہمارے ساتھ کے جو لوگ ہیں ان میں یہ ذرا زیادہ پسند ہیں۔ یوں بہت سے اور بھی ہیں جن کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔

عبادت : جوش صاحب کی چیزیں آپ نے پڑھی ہیں ؟

فیض : جی ہاں !

عبادت : جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض : جوش صاحب بزرگ ہیں ہمارے ـــــ بہت دنوں سے نیاز ہے اُن سے۔ اور اُن میں خاص قسم کا ایک وفور اور ایک خاص قسم کی قدرتِ کلام ہے ـــــ تو اس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں ـــــ لیکن وہ بہت پُر گو ہیں۔ غالباً قدرتِ کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں پر ایک حد تک یہ ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے اور بالکل خالص یا کہئے کم خالص تجربات میں کچھ زیادہ تمیز نہیں کرتے ـــــ اور احتیاط نہیں کرتے ـــــ تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زورِ کلام میں کہی ہیں۔

عبادت : فیض صاحب، نظریے کے بغیر شاعری یا اعلیٰ شاعری یا بڑی شاعری ناممکن ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر کوئی نہ کوئی نقطۂ خیال کسی شاعر کے پاس ضرور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض: نظریے کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر ہمیشہ بہت باقاعدگی سے کوئی فلسفے کا تھیسس یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظّم اور مربوط نظام ہمیشہ پیش کرے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ جو ہے، یا کوئی بھی تجربہ، وہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر آپ ایک ہی چیز کو دیکھیں تو اس کو آپ کئی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں ــــ تو مجھے کوئی ایسا بڑا شاعر ــــ بڑا شاعر یا بڑا فن کار، ادیب، مصوّر، موسیقار ایسا یاد نہیں ہے جس کے ذہن میں اپنے گرد وپیش کے متعلق کچھ تاثر، کچھ نہ کچھ احساس، کچھ نہ کچھ نظریہ کہہ لیجئے، جو کسی احساس اور تجربے پر منحصر ہو ــــ ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ دنیا اچھی ہے یا بری ہے۔ لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا بُری طرح رہتے ہیں یا ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے یا نہیں کرنا چاہیئے۔ یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کسی طرف نہیں جا رہی ہے۔ جس شخص کے ذہن میں اس قسم کا کوئی نظریہ نہ ہو وہ کوئی زیادہ حسّاس اور ذی شعور آدمی نہیں ہو سکتا اور ہر فن کار اور ادیب کے لیے شعور تو لازمی ہے۔

عبادت: بالکل صحیح بات ہے ــــ اچھا فیض صاحب! خاصی باتیں ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے ان تمام باتوں پر روشنی ڈالی ــــ بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی ایک نظم اور ایک غزل بھی ارشاد فرمائیں گے۔

فیض: ضرور ــــ حال ہی کے زمانے کی ایک نظم ہے۔

عبادت: ارشاد۔

فیض: عرض کرتا ہوں ــــ "تم مرے پاس رہو" ــــ اس کا عنوان بھی یہی ہے ۔

تم مرے پاس رہو

مرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو

عبادت: اب غزل بھی ارشاد فرمائیے۔

فیض: اچھا صاحب! تو غزل بھی اسی زمانے کی ہے بلکہ آپ ہی کے شہر لندن میں لکھی گئی ہے

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

ہر منظرِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربہ دری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیضؔ کبھی بخیہ گری نے

عبادت: فیض صاحب! ایک اور تازہ غزل آپ نے چند روز ہوئے مجھے سُنائی تھی۔ وہ بھی عنایت فرمائیے۔

فیض: عرض کرتا ہوں ؎

شرحِ فراق مدحِ لبِ مشک بو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سنے گی رات کہاں تک سُنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے رُوبرو کریں

ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سُنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں محتسبو! مُنہ نہ آئیو!
سر بیچ دیں تو فکر دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

عبادت: بہت بہت شکریہ!

۳

فیض صاحب نے اپنی زندگی کا خاصا حصّہ مغربی ممالک میں گذارا ہے۔ لیکن اُن پر مغرب اور اُس کی تہذیب و ثقافت کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا مزاج مشرقی ہے، اور وہ مشرقی ماحول ہی میں طمانیت محسوس کرتے اور خوش رہتے ہیں۔ انہوں نے مغرب سے قریب ہونے کے باوجود اپنے لباس، اپنی زبان، اور اپنی دلچسپیوں کو خیرباد نہیں کہا، انہوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی جو بے تکلفی سے اُردو بولتی ہیں، اور فیض صاحب کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی مشرقی خاتون اس طرح اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہوگی۔ فیض صاحب کی بچیوں نے انگریز ماں کی سائے میں پرورش پائی ہے لیکن وہ فصیح اُردو اس طرح بولتی ہیں کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ ان بچیوں کے مزاج بھی مشرقی ہیں، اور یہ سب کچھ فیض صاحب کے مشرقی مزاج کا نتیجہ ہے۔

فیض صاحب ایک اچھے شوہر ایک اچھے باپ اور ایک اچھے دوست ہیں۔ انہیں ہر حال میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہتا ہے، اور ہمیشہ اِن ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بڑے ہی وضع دار انسان ہیں اور انسان دوستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ وہ بزرگوں کی عزت کرتے ہیں، اور چھوٹوں پر شفقت اور محبت کے پھول برساتے ہیں۔ انسان کی خدمت اُن کا نصب العین ہے۔ انسانیت کے دُکھ سے اُن کا سینہ فگار ہے، وہ کسی شخص کی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتے کسی کا غم اُن سے دیکھا نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خیر کی قدروں کے علم بردار ہیں مساوات کے قائل ہیں طبقاتی تفریق انہیں ناپسند ہے۔ وہ دولت کی صحیح تقسیم چاہتے ہیں تاکہ انسان افلاس کا شکار نہ ہو، کیونکہ افلاس ان کے خیال میں انسان کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے مریض بنا دیتا ہے۔ وہ ظلم اور جبر و استبداد کے دشمن ہیں، انسانیت کی زخمی آوازوں کو سُن کر اُن کا دل بھر آتا ہے، اور وہ اس صورت حال پر آنسو بہاتے ہیں اور انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

اُن کی شاعری کے بنیادی موضوعات یہی ہیں، اور انہیں موضوعات نے انہیں بڑا شاعر بنایا ہے۔ وہ حُسن کے شیدائی ہیں، حیات و کائنات اور انسانی رشتوں کے حسن کو دیکھتے اور ہر چیز میں اس حسن کو تلاش کرتے ہیں، اور اسی نسبت سے وہ ایک بہت بڑے خالق جمال ہیں۔

اور یہی پہلو اُن کی شخصیت اور شاعری کا طرۂ امتیاز ہے!

بلونت سنگھ

یہ بلونت سنگھ ہے!

میں نے اس سے محبت کی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کے بعض بہترین لمحے گزارے ہیں۔ اور اِس طرح مجھے اس کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن آپ صرف اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ تو بہت کم نظر آتا ہے۔ اور اگر کبھی نظر آ بھی جائے تب بھی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وہ آپ کی نگاہ سے بچ کر چلتا ہے اور کسی حالت میں بھی آپ کو اپنے وجود کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ یا یوں کہیئے کہ وہ آپ کو نہیں دیکھتا۔ نگاہ بچا کر چلتا ہے اور اس کی یہ کوشش نہیں ہوتی کہ وہ آپ کے وجود کو محسوس کر لے۔ اس لیئے آپ صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کو بھی غنیمت ہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ تو جھلک دکھانے کا بھی قائل نہیں۔ لیکن آپ کو اس کی جھلک کہیں نہ کہیں نظر ضرور آ جائے گی۔ اور اس کی جھلک دیکھ کر آپ کو اس سے ملنے کا خیال بھی ضرور آئے گا۔ لیکن اس سے ملنا تو جوئے شیر کا لانا ہے۔

وہ ملنے کے باوجود کسی سے نہیں ملتا اور آپ ملنے کے باوجود اس سے نہیں مل سکتے۔ یوں ملاقات تو اس سے ایسی کچھ مشکل نہیں ہے لیکن ملاقات کے بعد آپ دیر تک یہ سوچتے رہیں گے کہ آیا بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی بھی یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ملاقات کا قائل ہی نہیں ہے۔ آپ اس سے ملنے جائیں تو وہ سٹ پٹا جائے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا کرے۔ آپ اس سے مزاج پوچھیں گے وہ چپ رہے گا۔ آپ اس سے ملاقات پر مسرت کا اظہار کریں گے وہ چپ رہے گا ایک آدھ فقرہ گھبراہٹ میں ڈوبا ہوا اس کے منہ سے نکل جائے تو غنیمت سمجھئے۔ ورنہ وہ ان لوگوں کے سامنے بولتا ہی کب ہے جن سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ایسی ملاقاتوں میں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار بڑھتے جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس عالم میں اس پر ترس کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ہمدردی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی طرح ممکن ہے کہ آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو لیں۔ اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اس پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اسی وقت ہوگا جب آپ اس سے رخصت ہونے لگیں گے۔ آپ کو اس کے سر سے ایک بوجھ سا اترتا ہوا محسوس ہوگا۔ اس کی سنجیدگی پر تولتی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کے جسم میں زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہوئے دکھائی دیں گے اور آپ کے جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن آپ اس سمٹنے کے منظر کو دیکھ نہیں سکیں گے کیونکہ یہ کیفیت تو آپ کے رخصت ہو جانے کے بعد اس پر پوری طرح رونما ہوگی۔

میں جب اس سے دلّی میں پہلی بار ملا تو مجھے اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دلّی ایک دفعہ اُجڑ کر ازسرِ نو بس چکی تھی اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر وہاں سے رخصت ہو کر پنجاب اور سندھ پہنچ چکے تھے اور پنجاب سے کچھ

ادیب اور شاعر مشرقی پنجاب اور دلّی آگئے تھے۔ اس اعتبار سے دلی اب پنجاب ہوگئی تھی۔ لیکن پہلے اس میں جو پنجاب کا ساحُسن تھا وہ اب بقول شخصے ملتان بہہ گیا تھا۔

تھا ذوق پہلے دلّی میں پنجاب کا ساحُسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

آدمی ان دِنوں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ادبی محفلوں کے لیے آنکھیں ترستی تھیں۔ ادب و شعر پر بات کرنے والوں کو جی ڈھونڈتا تھا۔ آزادی اپنے ساتھ ایک سیلاب بلا لائی تھی۔ ویسے ایک ہنگامہ تھا۔ چپّے چپّے پر انسان ہی انسان تھے۔ آبادی کئی گنی زیادہ ہوگئی تھی لیکن ہم مذاق انسان کا ملنا ایک معجزہ تھا۔ میں ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ ملنے کا قائل نہیں ـــــ بلکہ میں تو ان سے اکثر دامن بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اس دورِ پُر آشوب میں ایک ایسی تنہائی کا احساس ہوتا تھا جو اس سے قبل میری زندگی میں کبھی بھی نہیں آئی تھی۔ اس تنہائی نے مجھے اس دلّی میں اجنبی بنا دیا تھا جہاں مجھے کبھی اجنبیت کا خیال بھی نہیں گزرا تھا۔ جہاں کی ہر چیز سے مجھے بوئے اُنس آتی تھی ـــــ اب وہی دلّی میرے لیے اجنبی ہوگئی تھی۔ اس کی ایک ایک چیز میں مجھے غیریت کا احساس ہوتا تھا۔ اس ماحول میں ایسے لوگوں کو آنکھیں ڈھونڈتی تھیں جو اپنے ہم مذاق اور ہم مشرب ہوں۔ اور اس کے حصول کی تمنّا نے مجھے ادیبوں اور شاعروں کے کچھ زیادہ ہی قریب کر دیا تھا۔ ورنہ میں کہاں، اور کہاں ان کی زنگارنگ صحبتیں!

پریم ناتھ درؔ کی ذات ان دِنوں میرے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے اس زمانے میں ادب و شعر کی اس شمع کو فروزاں رکھا جو آندھیوں کی زد پر تھی۔ ادبی محفلوں کو منعقد کرنا اور بچے کھچے ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسے اس زمانے میں بھی اس کے مکان پر ہوتے رہے تھے جب دلّی میں خون کا مینہ برس رہا تھا۔ یہ جلسے اخبارات میں اعلان کے ساتھ ہوتے تھے۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی

کہ دلی میں ابھی تک اس حلقے کے لوگ کس طرح موجود ہیں، انہیں تو ہجرت کر جانا چاہیئے تھا — لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جلسے ہوتے رہے۔ انہیں کوئی نہ روک سکا کیونکہ ان کے پیچھے پریم ناتھ دَر کی شخصیت تھی۔ اس زمانے میں ایک جلسہ ایسا بھی ہوا جب صدر اور سیکریٹری تو موجود تھے لیکن حاضرین میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ایک جانور کو سامنے بٹھا کر جلسے کی کاروائی مکمل کی گئی — اس مستعدی کا اثر بڑا خوشگوار ہوا۔ جیسے جیسے حالات بہتر ہوتے گئے، لکھنے والوں نے جلسوں میں زیادہ پابندی اور مستعدی سے شریک ہونا شروع کر دیا۔ ان دنوں جو ادیب بھی دلی میں آتا ان جلسوں میں ضرور شریک ہوتا۔ اس طرح ہر اتوار کو تقریب ملاقات نکل آتی تھی۔

بلونت سنگھ چونکہ دلی آ گیا تھا، اس لیے خیال تھا کہ وہ بھی ان جلسوں میں ضرور شریک ہوگا لیکن وہ نہیں آیا۔ پیغام بھی بھجوائے گئے لیکن اس نے اس طرف رُخ نہیں کیا۔ طرح طرح سے ٹالنے کی کوشش کی — حقیقت یہ ہے کہ وہ جلسوں کی دنیا کا انسان نہیں تھا۔ میں نے اس کو کبھی کسی جلسے میں نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ دلی میں اس وقت ادبی جلسے کچھ کچھ ہونے لگتے تھے۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے لیکن بلونت سنگھ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ اس کی اس روپوشی نے آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکایا۔ وقت کے ساتھ یہ خواہش بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

جوش صاحب ان دنوں دلی آ گئے تھے اور ان کی ادارت میں "آجکل" باقاعدگی سے نکلنے لگا تھا۔ جوش صاحب کے ساتھ آج کل کے ادارے میں عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ بھی شامل تھے۔ ان کا دفتر علی پور روڈ پر تھا۔ یونیورسٹی وہاں سے ایسی کچھ دور نہیں تھی۔ میں جب وہاں سے پڑھانے کے بعد واپس ہوتا تو فلیگ سٹاف روڈ کی پہاڑی سے نیچے اتر کر جوش صاحب سے ملنے کی غرض سے علی پور روڈ پر "آجکل" کے دفتر پہنچ جاتا

تھا جوش صاحب سے جب دلچسپ باتیں شروع ہوتی تھیں تو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا اس لیے
کئی دن تک پہلے سے ارادہ کر لینے کے بعد بلونت سنگھ سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں دفتر پہنچا تو جوش صاحب غائب تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں عرش ملسیانی بیٹھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا "بلونت سنگھ دلی" میں ہے لیکن اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملنے کو جی چاہتا ہے"۔ کہنے لگے "آیئے آپ کی ملاقات کرائیں۔ قریب ہی بیٹھتا ہے"۔

ہم دونوں بلونت سنگھ کے کمرے میں پہنچے۔ کمرہ تاریک تھا۔ برقی لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی اور اس لیمپ کی روشنی میں ایک بڑا خوبصورت سا سکھ میز پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں ایک شانِ بے نیازی تھی —— ایک ایسی بے نیازی جو انہماک کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔ جس میں ایک بے پایاں سکون ہوتا ہے۔ ایک بے اندازہ گیرائی ہوتی ہے۔ اس بے نیازی کا اظہار صرف اس کے انداز ہی سے نہیں ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر اُس کی ساری شخصیت سے یہ خصوصیت ٹپک رہی تھی —— اس کی سنجیدگی نے اس خصوصیت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کی سادگی اس خصوصیت کی کچھ اور بھی غمازی کر رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے جسم پر سادہ سا لباس تھا۔ ایک پتلون کے ساتھ ایک کوٹ اس کے جسم پر تھا۔ لیکن اس کوٹ کے ساتھ گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ قمیص کا کالر کوٹ کے کالر کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ قمیص کے بٹن تک ٹھیک سے لگے ہوئے نہیں تھے اور اس کے نتیجے میں بنیان قمیص کے اندر سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لباس میں اگر کہیں باقاعدگی کا احساس ہوتا تھا تو پگڑی میں اس کی پگڑی بڑے فنکارانہ انداز میں بندھی ہوئی تھی۔ پگڑی کا رنگ بھی اپنے اندر ایک دلکشی رکھتا تھا۔ اس رنگ میں افشاں کی جو چمک تھی اس نے اس دلکشی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر یہ پگڑی بہت ہی کھل رہی تھی۔ باقاعدگی سے گندھی ہوئی داڑھی نے اس کے رنگ کو نکھار دیا تھا۔ اس کی

ذہانت نے آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دی تھی ـــــ یہ باتیں اس وقت مجھے اسکی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آئیں ـــــ لیکن خود بلونت سنگھ کو اس کا احساس نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ ان خصوصیات کو پیدا کرنے میں اس کی شعوری کوشش ذرا بھی شامل نہیں تھی۔ تکلّف سے اس کا حُسنِ ذاتی بالکل بری تھا۔ اسی لیے باوجود سکھ ہونے کے اس میں ایک ایسا حُسن تھا اور اس حُسن میں ایک ایسی دلکشی تھی جو بے تکلفی ہی کے سہارے پیدا ہو سکتی ہے۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بلونت سنگھ نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے اس سے قبل ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ قبل اس کے کہ عرش صاحب رسمی تعارف کراتے ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے برسوں کے پُرانے ساتھی ہیں۔ پھر ہم بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عرش صاحب تو تھوڑی دیر میں معذرت کر کے چلے گئے۔ لیکن ہم دونوں اس پہلی ملاقات میں بلا مبالغہ تین گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔

یہ باتیں کتنی دلچسپ تھیں۔ ان میں کیسی رنگارنگی تھی۔ ان میں کس درجہ تنوع تھا ایسی باتیں تو میں نے طالب علمی کے زمانے میں کی تھیں۔ بین الاقوامی سیاسی اور ادبی تحریکات سے لے کر عورت کے حُسن اور اس کے سینے کی جاذبیت تک پر ہم بے شمار موضوعات پر باتیں کرتے رہے تھے اس گفتگو میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بلونت سنگھ کو سیاست اور ادب سے کہیں زیادہ عورت کے حُسن اور اس کے سینے سے دلچسپی ہے۔ لیکن اس دلچسپی میں جنسی بھوک اور تعیش پسندی کو دخل کم ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے حُسن کے جمالیاتی احساس کو دخل زیادہ ہے۔ یہ احساس ہمیشہ میں نے اس کی شخصیت پر محیط ہی دیکھا۔ اسی ملاقات میں اس نے کئی بار اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم سب پڑھتے لکھتے ہیں، ادب کی تخلیق کرتے ہیں لیکن زندگی کو بسر کرنا نہیں جانتے ـــــ "انسانی زندگی کتنی حسین ہے،

اس میں کس درجہ دلکشی ہے۔ اس کی مسرتوں کا صحیح احساس ہمیں نہیں ہوتا۔ ہم تو مسرتوں کا خون کرتے رہتے ہیں — اس زندگی میں اس سے بڑی بات بھلا کیا ہوگی کہ انسان کے پاس رہنے کے لیے ایک خوبصورت سا مکان ہو۔ محبت کرنے کے لیے ایک بڑی خوبصورت سی لڑکی ہو جس کے سہارے وہ اطمینان اور سکون کی ایسی بزم نشاط کو آراستہ کرے جس میں زندگی کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا گزر ہی نہ ہو سکے — انسانی زندگی میں مسرتوں کو بہم پہنچانے میں عورت کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن عورت کا مطلب تعیش نہیں ہے۔ وہ تو صحیح اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے لیے ایک سہارا ہے — اس طرح کی بے شمار باتیں وہ مجھ سے کرتا رہا۔

میں ابتدائی ملاقاتوں میں ذرا کم کھلتا ہوں۔ اس لیے مختلف موضوعات پر جو گفتگو ہوئی اس میں میں نے اپنے خیالات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس طرح بلونت سنگھ نے اپنے آپ کو پوری طرح مجھ پر ظاہر کر دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دلّی کے دورانِ قیام میں جس طرح میں اسے سمجھتا تھا اتنا اور کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے اِس کے کسی اور سے اتنے گہرے تعلقات بھی نہیں تھے اس حقیقت کو اس نے بھی اس پہلی ملاقات ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ بار بار وہ یہ کہتا تھا کہ ذہنی طور پر تم سے کتنا قریب ہوں۔ ہم دونوں کتنی جلد گھل مل گئے ہیں۔ میرے آس پاس کئی لوگ بیٹھتے ہیں لیکن میری ان سے اتنی گاڑھی نہیں چھن سکتی۔ میں آج تک ان سے بے تکلف نہیں ہوا — لیکن میں نے تمہارے سامنے اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

اور یہ ایک حقیقت تھی جس کو میں بھی برابر شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا!

دیر ہو گئی تھی، اس لیے میں بلونت سنگھ سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا

— اور پھر ہم برابر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ناممکن تھا کہ میں یونیورسٹی سے واپسی پر بلونت سنگھ سے ملنے کے لیے "آجکل" کے دفتر نہ جاؤں۔ اگر کبھی میں دو تین دن نہ پہنچتا

تو وہ شکایت کرتا۔ "تم آتے نہیں ـــ میں تمہارا منتظر رہتا ہوں۔ مجھے دن کو فرصت نہیں ہوتی ورنہ میں خود تمہارے ہاں پہنچ جایا کرتا ـــ میں کسی سے نہیں ملتا ـــ میرا یہاں کوئی ہم مذاق نہیں ہے ـــ کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا ـــ اور تم جانتے ہو میں بہت کم لوگوں سے ملتا ہوں"۔

شاید ہی کوئی ملاقات ایسی ہوگی جس کا آغاز ان باتوں سے نہ ہوا ہو!

اس لیے تقریباً میرا یہ معمول ہو گیا کہ یونیورسٹی کے بعد اس کے پاس ضرور جاتا۔ کمرے میں داخل ہو کر سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا ـــ "یار، ادھر بیٹھیں گے"۔ دفتری میز سے ہٹ کر ایک لمبی سی کرسی پڑی تھی وہ اصرار کر کے مجھے اس پر بٹھا دیتا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ کر باتیں کرنے لگتا ـــ چائے آجاتی اس کا دور چلتا رہتا ـــ اور بعض بعض دن تو ہم شام تک باتیں کرتے رہتے ـــ

اکثر ایسا ہوا ہے کہ شام ہو گئی ہے۔ اور پھر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اب بجائے اپنی اپنی جائے قیام پر جانے کے سیدھے کناٹ پلیس، چلیں گے اور کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر شام گزاریں گے ـــ چنانچہ ہم اس طرح کبھی 'والگا' میں بیٹھ جاتے۔ کبھی 'کیبسی' میں شام گزارتے۔ کبھی 'نرولا' میں جا بیٹھتے اور کبھی 'وینگر' اور 'پکاڈلی' کی سیر کرتے۔ غرض شاید ہی نئی دلی کا کوئی ریستوران ایسا ہو جس میں ہم نے شام نہ گزاری ہو ـــ ان ریستورانوں میں بیٹھ کر ہم خوش گپیاں کرتے۔ آنے والے لوگوں کو دیکھ کر ان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے۔ عورتوں کے حسن سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتے۔ اس طرح ان شاموں میں بڑی دلآویزی پیدا ہو جاتی تھی ـــ ہم اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتے تھے۔

بلونت سنگھ کے پاس ان دنوں مکان نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی عزیز کے پاس پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کھانا بھی کناٹ پلیس ہی سے کھا کر جائے قیام پر واپس جائے ـــ چنانچہ کھانا بھی وہ اکثر کناٹ پلیس ہی میں کھا لیتا تھا۔ وہ

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا ہے۔

انسانی زندگی میں کھانے کو ــــ اور خصوصاً شام کے کھانے کو وہ بڑی اہمیت دیتا تھا۔ میں نے اسے صرف کھاتے ہوئے ہی نہیں دیکھا ہے، اچھے کھانے کی تلاش میں سرگرداں بھی دیکھا ہے۔ نئی دلی کے ریستورانوں میں اچھا خاصا کھانا مل جاتا تھا لیکن اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی تھی چنانچہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمیں بعض اوقات ویگر، پکاڈلی، والگا، ایلیس اور ایمبسی کی فضا سے ان دوکانوں میں بھی لے گئی ہے جہاں ظاہری آرائش و زیبائش کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ جہاں دوکان کا مالک خود ہی پکاتا خود کھلاتا اور دوکان کے قریب سے گزرنے والوں کو خود ہی آواز دے دے کر بلاتا ہے۔ دلی میں تقسیم کے بعد اس طرح کی دوکانیں بے شمار کھل گئی تھیں۔ جگہ جگہ اس طرح کے کھانے پینے کی چیزوں کے بازار بن گئے تھے۔ گوشت تو اس طرح بکتا تھا کہ اس کو دیکھ کر مقامی ہندو دکانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ کون سی مصیبت آگئی ہے

بہر حال یہ سلسلہ رُکنے والا نہیں تھا ــــ کناٹ سرکس میں بھی اسی طرح کی بہت سی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ مُرغ، تیتر، بٹیر اور نہ جانے کون کون سے بھُنے ہوئے پرندے ان دوکانوں پر لٹکے رہتے تھے ــــ بلونت سنگھ کبھی کبھی ان دوکانوں پر بھی کھانا کھاتا تھا۔ اور اصرار کے ساتھ کھاتا تھا۔ میں ہمیشہ اس کو ایسا کرنے سے روکتا بھی تھا لیکن میری کچھ بھی پیش نہیں جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرغ جیسا ان دوکانوں پر مل سکتا ہے ویسا بڑے ریستورانوں میں نہیں مل سکتا ــــ مُرغ تو خالص ہندوستانی انداز میں پکنا چاہیئے۔ اور اس کے لیے ایک ہندوستانی فضا کی ضرورت ہے۔ یہ فضا ان ریستورانوں میں نہیں ہوتی۔ اس لیے کبھی کبھی ہمیں ان دوکانوں کا مزہ بھی چکھنا چاہیئے ــــ اور وہ بے دھڑک ان دوکانوں میں داخل ہو جایا کرتا تھا۔ میں کھانے میں تو اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا کیونکہ لٹکے ہوئے پرندوں کی وجہ سے جو ہیبت ناک فضا پیدا ہوتی تھی وہ مجھے ایسا کرنے

سے باز رکھتی تھی۔ شاید میں اس ماحول کا انسان نہیں تھا۔ لیکن بلونت پر یہ کیفیت کبھی بھی طاری نہیں ہوئی۔ وہ میرے لیے ہلکی سی کوئی سبزی وغیرہ کی چیز منگوا دیتا ـــــ اور خود اپنے لیے مُرغ، تیتر، بٹیر، انڈے اور نہ جانے کیا کیا لانے کا آرڈر دیتا۔ اور پھر کھانے کے دوران میں ان سب کی ایسی تعریفیں کرتا کہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ کھانے کے دوران میں اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور وہ کہتا "یار یہ سب زندگی کی نعمتیں ہیں۔ یہ سب اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ انسان ان سے لطف اندوز ہو۔ ان سب کو کھانے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ـــــ افسوس ہے تم ان سے محروم ہو ـــــ کھایا کرو۔ یار! زیادہ سے زیادہ کھایا کرو! ـــــ کہ کھانا زندگی کی بڑی اہم، بلکہ سب سے اہم حقیقت ہے ـــــ میں تو حیران ہوں کہ تم زندہ کیسے ہو؟"

اور واقعی مجھے ان لمحوں میں اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہوتا تھا!

ـــــ کھانے کے بعد کافی یا چائے پینے کی غرض سے ہم کسی اچھے سے ریستوران میں جا بیٹھتے تھے اور اس ریستوران کی سہانی فضا میں گھنٹوں گپ رہتی تھی۔ بلونت کی طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ اچھا ماحول ہو تو وہ کھُلتا تھا۔ اس کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے عمدہ فقرے چُست کرنے لگتا تھا۔ لطیفے اس کے ذہن میں ڈھلنے لگتے تھے۔ اس کے باغ و بہار ہونے کا اندازہ اسی عالم میں ہوتا تھا ـــــ بعض اوقات تو اس کی طبیعت اس ماحول میں اس حد تک رواں ہو جاتی تھی کہ اسے طرح طرح کی شرارتیں سُوجھنے لگتی تھیں ـــــ بالکل ایسی شرارتیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انڈر گریجوایٹ طالب علموں سے سرزد ہوتی ہیں۔

ایک دن کا واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا!

کھانا کھانے کے بعد یہ طے پایا کہ آج کافی پی جائے گی۔ چنانچہ ہم کافی پینے کے خیال سے "والگا" میں جا بیٹھے۔ بلونت سنگھ نے کہا "آج میں کریم کی کافی پیوں گا"ـــــ

مجھے کریم کی کافی پسند نہیں۔ کیونکہ کافی کے مزے کو خراب کر دیتی ہے۔ اس لیے میں نے جواب دیا کہ "تم کافی کے بجائے کریم پیو" —— میں نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ لیکن وہ اس پر تیار ہو گیا۔ کہنے لگا "پھر آج میں کریم ہی پیوں گا —— اور دیکھو ساتھ ہی تمہیں تماشا بھی دکھاؤں گا —"

میں نے کہا "تماشا کیسا؟"

وہ کہنے لگا "ابھی شروع ہوتا ہے!"

اور اس نے بیرے کو آواز دی اور دو کریم کافی لانے کا آرڈر دیا۔ بیرا تھوڑی دیر میں کافی اور کریم لے آیا اور ہم کافی بنا کر پینے لگے۔ دس منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ اس نے پھر بیرے کو بلایا اور کریم لانے کے لیے کہا۔ بیرا یہ سن کر سٹ پٹا سا گیا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

بلونت سنگھ نے اس سے پھر کہا "—— کریم لاؤ!"

اس نے جواب دیا "کریم تو میں ابھی دے کر گیا تھا"

"مجھے کریم چاہیئے"۔ بلونت سنگھ نے کہا۔

بیرے نے پروپرائٹر کو اطلاع دی، اور کریم کا ایک اور جگ لا کر رکھ دیا۔ تیسری دفعہ اس نے پھر کریم منگوائی۔ بیرا پھر کریم کا ایک جگ لایا۔ اور اس طرح بلونت سنگھ کافی کی کوئی تین چار پیالیاں پی گیا جس میں کافی کم اور کریم زیادہ تھی۔

بیرا جب بل لایا تو اس کے ساتھ کریم کا ایک بل علیحدہ بھی تھا۔ بلونت سنگھ نے اس سے پوچھا کہ یہ کریم کا بل علیحدہ کیوں ہے؟ بیرے نے جواب دیا کہ کریم علیحدہ آتی تھی —— اس نے کہا۔ لیکن "پر ہیڈ" کا تو یہ اصول ہوتا ہے کہ جس قدر اور جتنی بار بھی چائے یا کافی پی جائے بل پر ہیڈ کے حساب ہی سے دینا پڑتا ہے"۔ بیرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیونکہ بلونت سنگھ بات اصولی طور پر صحیح کہہ رہا تھا۔ "وانگا" کے پروپرائٹر

ایک سردار صاحب تھے جب بیرے نے انہیں یہ روداد سُنائی تو وہ خود آئے اور انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ بلونت سنگھ کا جو خیال ہے وہ بالکل صحیح ہے اور وہ کریم کابل علیحدہ دینے کے مجاز نہیں۔ لیکن آج تک یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اپنی بات تسلیم کرالینے کے بعد اس نے کریم کا بل بھی ادا کر دیا۔ تھوڑی دیر 'والگا' میں خاصی دلچسپی رہی۔ ہر شخص کو اس بات کا علم ہو گیا اور یہ بات تھوڑی دیر کے لیے ہر میز پر موضوعِ بحث بنی رہی۔

اِس طرح کی حرکتیں وہ کبھی کبھی ضرور کرتا تھا۔

یہ دیکھ کر کہ بلونت سنگھ کو کھانے پینے سے حد درجہ دلچسپی ہے، میں نے اس کو ایک دن کھانے پر بلایا۔ میں ان دنوں دلّی میں بڑی ہی بے سرو سامانی کے عالم میں تھا۔ فسادات میں سب کچھ لٹ چکا تھا۔ بیٹھنے تک کی جگہ میرے پاس نہیں تھی لیکن خیر ان دنوں ایک ملازم مل گیا تھا جو میرا کھانا پکا دیتا تھا۔ ہر چند کہ وہ کچھ بے وقوف سا تھا لیکن بے سرو سامانی میں ایک بہت بڑا سہارا تھا۔۔۔ خیر، تو میں نے بلونت سنگھ کو کھانے پر بلالیا اور یہ طے پایا کہ کھانا کھانے کے بعد دن میں کوئی اچھا سا فلم دیکھا جائے گا۔

جس دن بلونت سنگھ کو آنا تھا، اس دن میں نے ملازم کو ہدایت کر دی تھی کہ سب چیزیں پکا کر رکھ لے لیکن روٹی کھانے کے وقت تیار کرے تاکہ وقت پر گرم مل سکے۔

اتوار کا دن تھا۔ بلونت سنگھ وقت سے پہلے آگیا۔ کھانے کے وقت تک ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن اس دوران میں اسے برابر بھوک لگ رہی تھی۔ اس کا اظہار وہ برابر کرتا جاتا تھا۔ میں وقت سے پہلے کھانا نہیں کھاتا اس لیے میں نے اس کو چھیڑا۔

"کیا تم ناشتہ کر کے نہیں آئے"؟

"صبح کو پورے سیر بھر دہی کی لسّی پی ہے"۔

"اور انڈے"؟

"انڈے تو صرف آج چار ہی کھا سکا ہوں"۔

"اور توس؟"

"توس تو آج نہیں ملے لیکن چار پراٹھے کھا لئے تھے"

میں نے کہا۔"اللہ تم پر اور تمہارے پیٹ پر رحم کرے" اور ملازم کو آواز دی کہ کھانا لگا دے۔

کھانا لگا دیا گیا اور گرم روٹی ایک ایک کر کے آتی رہی۔ بلونت سنگھ اس وقفے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ روٹی آنے سے قبل سالن پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتا۔ روٹی آجاتی تو روٹی اور سالن دونوں پر دست درازی کرتا۔ روٹی اور سالن کی آمیزش کو اس وقت اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ روٹی آتی تو سالن نہیں، سالن آیا تو روٹی نہیں۔ غرض یہ کہ روٹی اور سالن کا یہ چکر دیر تک چلتا رہا۔ میرا ملازم منہ چھپا کر ہنستا اور مسکراتا رہا —— اور میں بھی محظوظ ہوتا رہا۔ بلونت سنگھ کھانے کے دوران میں کھانے کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ اس دن تو اس نے تعریفوں کے اتنے پُل باندھے کہ میرے مُلازم نے اپنا دماغ خراب کر لیا کیونکہ وہ اس کے بعد اپنے آپ کو بہت بڑا خانساماں سمجھنے لگا۔ حالانکہ وہ جتنے پانی میں تھا، اس کو کچھ میں ہی خوب جانتا تھا۔ بلونت سنگھ نے اس کی تعریفیں کیں۔ اسی وجہ سے بلونت سنگھ سے زیادہ عزیز ان دنوں اس کے لیے اور کوئی نہیں رہا۔ پیٹھ پیچھے بھی یہی کہتا کہ "سردار صاحب کو کھانے کا شوق ہی نہیں۔ وہ اس فن کو بھی سمجھتے ہیں"—— من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو والا معاملہ تھا۔

کھانے کے بعد ہم سینما کی طرف چل دیئے۔

بلونت سنگھ کو سینما دیکھنے کا خبط تھا۔ ہفتے میں تین چار فلموں کا دیکھنا اس کے لیے ضروری تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ہر طرح کا فلم دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے کتنا ہی بور کرنے والا فلم ہو، لیکن وہ اس کو بڑے انہماک کے ساتھ دیکھتا رہے گا —— بلکہ میرا تو

یہ خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسے فلم ضرور دیکھتا ہے جو بور کرنے والے ہوں۔ فلم دیکھنے سے قبل اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سا فلم دیکھے گا۔ پہلے وہ نئی دلّی کے تمام سینماؤں کا طواف کرے گا۔ تصویریں دیکھے گا۔ پھر کچھ سوچے گا اور اس کے بعد کسی سینما میں بھی جا بیٹھے گا اور نہایت ہی انہماک اور خلوص کے ساتھ بڑے غور سے اس فلم کو دیکھے گا جس کو دیکھنے کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اس دن بھی پہلے اس نے مجھے نئی دلّی کے سارے سینماؤں کی سیر کرائی۔ سب سینماؤں میں تصویریں دیکھیں۔ ہر ایک پر اظہارِ خیال کیا۔ کسی کی ہیروئن اس کو پسند آئی۔ کسی کے ہیرو نے اس کا دل لبھایا۔ کسی کے حُسن کی دلآویزی اس کو بھائی —— اور پھر سب فلموں پر مجموعی طور پر تبصرہ کرنے کے بعد اس نے ایک ایسا فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ مہمل ہوگا۔ اس فلم کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کوئی امریکی فلم تھا جس میں ہیرو اور ہیروئن ساری زندگی مداری کا تماشا کرتے ہیں اور طرح طرح کے کرتب بھی دکھاتے ہیں۔ بلونت سنگھ نے ٹکٹ خرید لئے۔ ابھی فلم شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے اس لیے ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ واپس آکر جب ہال میں داخل ہوئے تو سارے ہال میں اپنے سوا کسی اور کو نہ پایا۔ میں اور بلونت سنگھ بس صرف دو آدمی تھے جو اس دن اس فلم کو دیکھنے آئے تھے۔ ہمارے انہماک پر سینما کے ملازموں تک کو تعجب ہو رہا تھا۔ ہم آخر وقت تک اس فلم کو دیکھتے رہے۔ اور ختم کر کے اُٹھے —— میں نے کئی بار درمیان سے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن بلونت سنگھ نے مجھے روک لیا۔ در حقیقت مجھے اس فلم کو دیکھ کر قے آنے لگی تھی۔ نہ اس میں کوئی کہانی تھی۔ نہ کوئی اور دلچسپی تھی۔ بس کرتب ہی کرتب تھے —— اور کرتب بھی خاص امریکی انداز کے، جن سے کم از کم میں کوئی ذہنی مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن بلونت سنگھ برابر اس کا اظہار کرتا رہا کہ وہ اس فلم سے صحیح معنوں میں محظوظ ہو رہا ہے۔ فقرے چُست کرتا، قہقہے لگاتا، مجھے چھیڑتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں بور ہو رہا ہوں۔ لیکن میرے

اس 'بور' ہونے سے وہ لطف لے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ 'بور' وہ خود بھی ہو رہا تھا لیکن اس کو پوری طرح ظاہر کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

فلم ختم ہو گیا تو ہم باہر نکلے۔ بلونت سنگھ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا "کہو بھئی کیسی رہی؟"

میں نے کہا "مجھے تو قے آ رہی تھی"۔

کہنے لگا "یار! اگر آج ہم یہ فلم دیکھنے نہ آتے تو پھر ہال میں کوئی بھی نہ ہوتا"۔

میں نے کہا "تو کیا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟"

اس نے کہا — "کبھی کبھی زندگی میں ایسے تجربے بھی ہونے چاہئیں"۔

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی میں تجربات کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کی خواہش اس کے اندر حد درجہ شدید تھی۔ وہ اسی لئے اس طرح کے لایعنی فلم بھی دیکھ لیتا تھا۔ اسے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ زندگی اور اس کی رنگارنگی کو دیکھنے کی غرض سے یہ سب کچھ کرتا تھا اور اس طرح اسے بہت سی ایسی چیزیں حاصل ہو جاتی تھیں، جن کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جہاں تک صرف اس طرح کے فلموں کا تعلق ہے وہ ان کو خوشی کے ساتھ نہیں دیکھتا تھا۔ ان کو دیکھ کر وہ خاصا 'بور' ہوتا تھا لیکن وہ فلم دیکھنے کب جاتا تھا۔ اسے تو اس ماحول کو دیکھنے کی خواہش ہوتی تھی جو ان فلموں سے پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو اس ردِعمل کو دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا جو اس طرح کے فلم پیدا کرتے ہیں — اسی لیے وہ ان فلموں کے تلخ گھونٹ بھی چڑھا لینے سے باز نہیں رہتا تھا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تنہائی بھی اس معاملے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تن تنہا اور اکیلا بھی سینما جا سکتا تھا۔ بلکہ اکثر و بیشتر تو وہ فلم اکیلا ہی دیکھتا تھا۔

وہ شام مجھے اب تک یاد ہے — کئی گھنٹے گھومنے پھرنے کے بعد ہم کناٹ پلیس

میں فوارے کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ مجھے اس دن مغرب سے قبل ایک جگہ پہنچنا تھا۔ اس لیے میں بلونت سنگھ کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے کہا "میں کوئی فلم دیکھ لوں گا — تم چلے جاؤ"۔

میں نے کہا "کون سا فلم دیکھو گے"

کہنے لگا "کوئی بھی دیکھ لوں گا — میرے لیے سب ایک سے ہیں"

اور میں نے اسے ایک سینما تک پہنچا دیا۔ اس نے ٹکٹ خرید لیا — اور وہ مجھے رخصت کر کے سینما ہال میں چلا گیا — بڑی گھٹیا سی فلم اس سینما میں چل رہی تھی۔ اس نے وہ فلم دیکھا اور دوسرے دن آ کر اس شام کی ساری روداد سنائی — لیکن اس روداد میں فلم سے زیادہ ان حالات کی تفصیل، اس ماحول کا بیان اور اس فضا کا ذکر تھا جس میں یہ فلم دیکھا گیا۔ بلونت سنگھ کے لیے یہ حالات، یہ ماحول اور یہ فضا ان پھولوں کی طرح تھی۔ جن سے شہد کی مکھی رس جمع کر کے شہد بناتی ہے۔ بلونت سنگھ شہد کی مکھی کی طرح ان سے اپنے فن کا شہد جمع کرتا تھا۔ اور اسی لیے اس کی بے چین روح ان کی تلاش میں ہر لمحہ اور ہر گھڑی سرگرداں رہتی تھی۔ اس میں اس کی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا — یہ خصوصیت تو اس کی زندگی کا ایک جزو تھی جس کو وہ کسی حال میں بھی اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کو اکثر تنہا دیکھا ہے لیکن اس کی زندگی میں مجھے تنہائی کبھی بھی نظر نہیں آئی ہے۔ وہ خلوت کو انجمن سمجھتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی خلوت انجمن سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ تنہا گھوم پھر سکتا ہے۔ تنہا سیر کر سکتا تھا، تنہا کھا پی سکتا تھا، تنہا خرید و فروخت کر سکتا تھا، تنہا سینما دیکھ سکتا تھا — ہر کام میں یہ تنہائی اس کی مونس و دمساز ہوتی تھی تنہائی ہی میں اس کے جوہر کھلتے تھے۔ تنہائی اسے شاندار بنا دیتی تھا اسی لیے وہ تنہائی کو ڈھونڈتا تھا۔ اس کے پیچھے بھاگا بھاگا پھرتا تھا کیونکہ جب بھی وہ تنہا ہوتا تھا تو اسے

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے محفل جمالی ہے —— اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تنہائی میں کسی محفل کو جما لیتا تھا۔

اگر آپ اسے تنہا دیکھیں —— اور آپ اسے تنہا ہی دیکھیں گے —— تو آپ اس کے چہرے پر ایک آسودگی نظر آئے گی —— ایک ایسی آسودگی جو کسی چیز کو پا لینے سے حاصل ہوتی ہے —— ایک ایسی آسودگی جو منزل سے ہم کنار ہو جانے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے —— تنہائی کے عالم میں وہ اس منزل سے ہم کنار نظر آتا تھا۔

تنہائی کے عالم میں، ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے، کسی خیال میں ڈوبا ہوا ہے۔ کچھ مسائل ہیں جن کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی گہری سنجیدگی اس احساس کو شدید سے شدید تر کر دیتی ہے اور اس طرح وہ دیکھنے والوں کو بھی ایک انجمن نظر آتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بلونت سنگھ کو تنہا دیکھ کر آپ کے ذہن کا اس طرف پہنچنا ناگزیر ہے کہ بلونت سنگھ تصورات کی نہ جانے کتنی دنیاؤں کو لیے پھرتا ہے —— بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ بلونت سنگھ انہی دنیاؤں کے مجموعے کا نام تھا

بلونت سنگھ کی شخصیت میں جس تنہائی کی کارفرمائی میں نے دیکھی وہ کوئی ذہنی اُلجھن نہیں ہے۔ وہ اس کے کردار کا لازمی جزو ہے اور اس کی صحت مندی کا یہ ثبوت ہے کہ بلونت سنگھ کی تنہائی پسندی آپ پر بوجھ نہیں بن سکتی۔ اس سے آپ پریشان بھی نہیں ہو سکتے۔ اس سے آپ کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ برخلاف اس کے آپ فوراً اس کی تنہائی کا جواز اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے —— اور اس میں آپ کو کامیابی ہو گی —— کیونکہ اس سے واقف ہوئے بغیر بھی آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ بلونت اس تنہائی میں بھی مصروف ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہے —— کم از کم مجھے یہ احساس ہمیشہ ہوا ہے —— یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اس کی تنہائی میں ایک ہمہ گیری دیکھی ہے جس کے لیے اگر میں "گمبھیرتا" کا ہندی لفظ استعمال کروں تو زیادہ صحیح ہے۔

یہ تنہائی بلونت سنگھ کا مزاج ہے۔ یہ اس کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا لازمی حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجلسوں اور انجمنوں کا انسان نہیں — وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے — اس کے بے تکلف دوست دو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے اسے لوگوں سے کتراتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اس کترانے میں احساسِ برتری نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی خواہش نمایاں ہوتی ہے۔

دلّی میں ہم اکثر شام کو ایک ساتھ نکلتے تھے۔ کبھی کبھی کناٹ پلیس" میں چند ایسے جاننے والوں سے ملاقات ہو جاتی تھی جو بلونت سنگھ کو نہیں جانتے تھے۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ وہ انہیں چھوڑ کر آگے نکل جاتا، اس ڈر سے کہ کہیں ان سے تعارف نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بعد جب بھی وہ اس کو دیکھیں گے تو ملنے کی کوشش کریں گے اور یہ بات اس کے لیے ایک مستقل دردِ سر بن جائے گی — اور یہ ہے بھی حقیقت اجنبیوں سے ملنا واقعی ایک دردِ سر ہوتا ہے۔

لیکن ایسے موقع پر مجھے ہمیشہ شرارت سوجھتی تھی — اور میں بلونت سنگھ کو چھیڑنے کے لیے تعارف کی رسمی منزلیں ضرور طے کرا دیتا تھا۔ جب میں کہتا کہ "آپ سے ملئے — آپ ہیں سردار بلونت سنگھ!" تو اس کی کسمساہٹ دیکھنے والی ہوتی تھی — ملنے والے صاحب سے تو وہ تکلّف برتتا لیکن میری طرف وہ ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھتا جیسے مجھے کھا لے گا —

جب وہ صاحب رخصت ہو جاتے تو وہ مجھ پر برس پڑتا — لیکن اس برس پڑنے میں ایک ایسی معصومیت ہوتی جس پر مجھے ہمیشہ پیار آجاتا۔ اور واقعی بلونت پیار کرنے ہی کی چیز تھا۔

بلونت سنگھ بڑا پیارا آدمی ہے۔ اس کی محبت بے پایاں نمایاں ہے۔ اس کا خلوص بے اندازہ ہے۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے لیکن جن سے ملتا ہے ان سے صحیح معنوں

میں ملتا ہے۔ ایسے لوگوں سے اس کی بے تکلفی ہوتی ہے۔ بے تکلفی کے بغیر وہ کسی سے نہیں مل سکتا۔ رسمی طور پر تو وہ ملنے کا قائل ہی نہیں وہ کم آمیز ضرور ہے لیکن اس کم آمیزی کا سبب یہ ہے کہ وہ دوسروں میں بھی اس بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کو تلاش کرتا ہے جو آجکل ناپید ہے ـــ اکثر اس نے مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس دنیا میں انسان بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اور چونکہ اچھا انسان نہیں ملتا اس لیے اچھا دوست بھی ناپید ہے کیونکہ اچھا انسان ہی اچھا دوست ہو سکتا ہے ـــ اور اس کی یہ تمام باتیں سُن کر میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہوں کہ انسانیت اور خلوص کی تلاش میں یہ شخص کس طرح سرگرداں ہے۔ انسانی محبت اسے کس قدر عزیز ہے ـــ ان قدروں کی اس کے نزدیک کس درجہ اہمیت ہے ـــ وہ تنہائی کو گوارا کر سکتا ہے لیکن خلوص اور محبت کے بغیر انجمنوں کی بھی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے ہمیشہ اسے محبت اور خلوص کی تلاش میں دیکھا ہے اس کی نگاہیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں جن میں یہ خصوصیات ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس کے دوست بن سکتے ہیں۔

دلی کا وہ واقعہ مجھے اب تک نہیں بھولا۔

اگرچہ گاندھی جی کی وفات کے بعد دلی میں فساد کی آگ بجھ گئی تھی لیکن اس کے باوجود دل ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے اور کچھ شرپسند عناصر کبھی کبھی کوئی نیا شگوفہ کھلاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات انفرادی اور ذاتی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ ان دنوں اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گیا تھا جو اگرچہ ایک خاص محلے تک محدود رہا لیکن اس سے لوگ پریشان اور ہراساں ہو گئے۔

بلونت سنگھ کو بھی اس کی خبر ملی۔ ان دنوں وہ شہر سے باہر کینٹونمنٹ میں اپنے کسی عزیز کے ساتھ رہتا تھا۔ اس واقعے کے دوسرے ہی دن کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے دفتر جانے کے وہ کالج کے پھاٹک میں داخل ہو رہا ہے میں نے پوچھا "اس وقت کیسے آ گئے ؟"

کہنے لگا "تمہاری خیریت معلوم کرنی تھی سُنا ہے شہر میں کچھ فساد ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا چل کر اپنے دوست کی خیر خبر لوں"۔

میں نے کہا "میں تو ابھی تک زندہ ہوں —— اور زندہ ہی رہوں گا۔ کیونکہ ۴۷ء کے ہنگاموں کو جھیل چکا ہوں —— اب اس سے بڑا ہنگامہ بھلا کیا ہو گا"؟

اس نے کہا "میں تو آج اسی خیال سے آیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ اور جب تک یہ فساد کی فضا ختم نہیں ہوتی تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا"۔

اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن سے اس کی بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

یہ محبت اس کی ایک ایک بات میں جھلکتی تھی۔ اور اس خلوص کا احساس اس کے ملنے والوں کو قدم قدم پر ہوتا تھا۔

مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب اس نے ایک بہت قیمتی سا کیمرہ خرید لیا تھا —— جب بھی ملاقات ہوتی وہ اس کیمرے کا تذکرہ مجھ سے ضرور کرتا۔ اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ابھی حضرت کو فوٹو گرافی کا نیا نیا شوق چرایا ہے اسی وجہ سے اس کی گفتگو ہر لمحہ اور ہر گھڑی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں تھی۔ درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کیمرے سے وہ میری تصویریں کھینچنا چاہتا ہے۔ مجھے تصویریں کھنچوانے سے اُلجھن ہوتی ہے۔ اس لیے میرا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں۔ لیکن ایک دن اتوار کو جب وہ مع کیمرے کے میرے ہاں آگیا اور یہ اصرار کیا کہ وہ تصویریں ضرور کھینچے گا، تب مجھ پر یہ حقیقت کھلی —— اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک پوری بارہ تصویریں نہیں کھینچ لیں۔ شاید ہی کوئی زاویہ ایسا ہو جس سے اس نے تصویر نہ کھینچی ہو۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ اپنا فلم کیوں ضائع کرتے ہو لیکن اس نے ایک نہ مانی —— اور یہ کہہ کر اس بات کو ختم کر دیا کہ "ہم کب ہر ایک کی تصویریں کھینچتے ہیں"۔

اور واقعہ یہ ہے کہ بلونت سنگھ ہر ایک کی کیا، کسی کی بھی ایک وقت میں بارہ تصویریں نہیں کھینچ سکتا تھا — اور بلونت سنگھ ہی پر کیا منحصر ہے، کوئی بھی نہیں کھینچ سکتا۔ بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کے بغیر یہ کس طرح ممکن ہے۔

بلونت سنگھ کو مردم شناسی میں کمال حاصل تھا۔ وہ صورت دیکھ کر پہچان لیتا تھا کہ انسان کتنے پانی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شخص کے بارے میں ایک رائے رکھتا تھا اور اس کی یہ رائے سو فیصدی صحیح ہوتی تھی اور اس رائے کے اظہار کرنے میں اسے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس رائے کا اظہار ضرور کرتا ہے — کبھی وضاحت کے ساتھ اور کبھی اشاروں اور کنایوں میں — لیکن لطف اسی وقت آتا ہے جب یہ اظہار اشاروں اور کنایوں کی صورت میں ہو — اور یہ لطف تو اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب یہ اظہار اس کے یہاں عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس اظہار کی عملی شکل میری نظر سے بھی گزری ہے۔

ایک دن میں اس کے دفتر میں پہنچا تو خاصا وقت ہو چکا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا "چائے منگواؤ"

"لیکن چائے تو آج ہم — اردو کے فلاں افسانہ نگار کے ساتھ پئیں گے"، بلونت سنگھ نے کچھ سوچ کر جواب دیا —

"کب — کس وقت؟"

"بس ابھی چلتے ہیں!"

"لیکن میں بن بلائے اس کا مہمان کیسے ہو سکتا ہوں؟"

"اس نے تمہیں بھی دعوت دی ہے — بار بار کہتا ہے ڈاکٹر صاحب سے مفصل ملاقات ہونی چاہیے۔ آج ہو جائے گی"۔

مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ صاحب قریب ہی کے کمرے میں بیٹھتے تھے۔

ہم دونوں ان کے یہاں پہنچے۔ بلونت سنگھ نے بیٹھتے ہی کہا ـــــ "لو بھئی ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں نے کہا آج مفصل ملاقات ہو ہی جانی چاہیئے۔ چائے منگواؤ۔ مفصل ملاقات کے بعد چائے بھی مفصل ہونی چاہیئے"۔

میں نے دل میں کہا "اللہ رحم کرے۔ آج یہ بڑے جارحانہ موڈ میں ہے"۔

خیر اُس نے چپراسی کو بُلایا اور "مفصل چائے کا آرڈر دیا ـــــ یہ "مفصل چائے" پورے ایک گھنٹے میں آئی ـــ لیکن جب آئی تو وہ واقعی "مفصل" تھی۔ ہم تینوں دیر تک باتیں کرتے اور چائے پیتے رہے ـــ

جب وہاں سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو میں نے کہا "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ میری اس کے ساتھ بے تکلفی نہیں ہے۔ میں اس کا بڑا لحاظ کرتا ہوں۔ اس کی داڑھی اور بالوں نے مجھے خاصا مرعوب کر رکھا ہے ـــ تمہیں اس طرح بے تکلفی سے چائے کے لیے نہیں کہنا چاہیئے تھا ـــ خاص طور پر میری موجودگی میں ـــ"

بلونت نے جواب دیا۔ "میری اس سے بے تکلفی ہے ـــ یہ چائے تو میں نے اس سے آج انتقاماً پی ہے"۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا وہ "کیسے"۔

بلونت سنگھ نے کہا ـــ "کل دفتر کے بعد یہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ ـــ کناٹ پلیس پہنچا تو کہنے لگا۔ "بہت تھک گئے ہیں۔ آؤ بھئی یہاں پارک میں بنچ پر بیٹھیں"۔ میں بیٹھ گیا ـــ پھر اس نے کہا بڑی گرمی ہے ـــ بہت پیاس لگی ہے" ـــ اور یہ کہہ کر اس نے پانی والے کو آواز دی جو بغیر گلاس کے اوک سے پانی پلاتا ہے ـــ پانی پینے کے بعد دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اور پھر جب رات ہونے لگی تو ہم دونوں جدا ہو گئے"۔

بلونت سنگھ کہنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کناٹ پلیس کیوں لے گیا تھا۔ کیوں اس نے دیر تک مجھ سے گفتگو کی تھی۔ بہر حال مجھے اس کے پانی پینے پر رحم آیا ـــ مجھے خود پانی پینے کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو کناٹ پلیس آنے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ کسی

خوبصورت سے ریستوران میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے ساری دنیا سے بے خبر ہو جانا چاہیئے — لیکن اس دن ایسا نہ ہو سکا — کیونکہ اس کو اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے انتقام کا یہ ذریعہ نکالا"۔

بات یہ تھی کہ وہ کسی ریستوران میں بیٹھنے کا قائل نہیں تھا — اور اس نے کبھی کسی کو بھولے سے بھی چائے نہیں پلائی تھی۔ بلونت سنگھ اسے اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اور اس سے بہتر اس کی عملی شکل نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بات اس کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی پر بھی دلالت کرتی ہے۔ بذلہ سنجی اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بظاہر وہ سنجیدگی کا سمندر نظر آتا ہے۔ لیکن اس سنجیدگی کے سمندر کی تہہ میں ظرافت اور بذلہ سنجی کی اَن گنت لہروں کا بسیرا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی ان لہروں میں ایسے مدو جزر کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ یہ لہریں جب بیدار ہوتی تھی تو سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔ ہر طرف بلونت سنگھ ہی بلونت سنگھ نظر آتا تھا۔

بلونت سنگھ کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی۔ اسے بے شمار لطیفے یاد ہیں۔ ہر بات میں اسے کوئی نہ کوئی لطیفہ یاد آجاتا تھا اور وہ اس لطیفے کو سُنا کر دوسروں کو ہنساتا ہے اور خود بھی ہنسنے لگتا تھا — اگر کسی موقع پر اسے کوئی موزوں لطیفہ یاد نہ آئے تو پھر وہ لطیفے کی تخلیق بھی شروع کر دیتا تھا —— اور پھر لطیفے ڈھلنے لگتے تھا۔ بے شمار لطیفے — اَن گنت لطیفے — جن سے فضا معمور ہو جاتی تھی اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا تھا جہاں زندگی خود ایک لطیفہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

بات لطیفے کی ہو اور سکھ درمیان میں نہ آئے یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔ سکھ اور لطیفہ تو لازم و ملزوم ہیں۔ بات اگر سکھوں کی چھڑ جائے تو بلونت سنگھ سکھ نہیں رہتا یا یوں کہیے کہ سب سے بڑا سکھ ہو جاتا تھا۔ سکھ کا نام آتے ہی اس کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی اور وہ ایک

ہی سانس میں سکھوں کے بے شمار لطیفے سُنا دیتا تھا۔ اور سناتا چلا جاتا تھا رُکتا ہی نہیں تھا کئی کئی گھنٹے اس نے مجھے سکھوں کے لطیفے سُنائے ــــــ اَن گنت، لاتعداد لطیفے ــــــ شاید سکھوں کے اتنے لطیفے مجھے کسی اور نے نہیں سُنائے اور دوسروں کی زبانی سُن کر اتنا لُطف بھی نہیں آیا۔ لطف تو جب ہے جب خود ایک سکھ سکھوں کے لطیفے سُنانے پر اُتر آئے اور سُناتا ہی چلا جائے ــــــ اور پھر ان میں خود اس کی تخلیقی کاوش بھی شامل ہو۔

بلونت سنگھ ہی مجھے ایسا سکھ نظر آیا۔

اس نے مجھے بے شمار لطیفے سُنائے ہیں۔ وہ سب تو میں آپ کو سُنا بھی نہیں سکتا لیکن ان کی لطافت کا اندازہ اس ایک لطیفے سے لگا لیجئے۔

ایک دن بات فلموں میں عُریانی کے موضوع پر چل نکلی تھی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا "لطیفہ سُنو" ــــــ میں نے کہا "سُناؤ!" کہنے لگا ــــــ ایک سردار صاحب کسی فلم کا ہر شو روزانہ دیکھتے رہے۔ اس فلم میں ایک سین ایسا تھا جس میں ایک عورت دریا میں نہانے کے ارادے سے اپنے کپڑے اتارنا شروع کرتی تھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کپڑے اتارنے کا کام ختم کر چکے ایک ریل گاڑی سامنے سے گزر جاتی تھی، اور اس طرح وہ سین ختم ہو جاتا تھا۔ سردار صاحب کو جب لوگوں نے کئی روز تک متواتر اس فلم میں آتے ہوئے دیکھا تو سینما کے ملازموں میں سے ایک صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھے کہ "سردار صاحب! شاید آپ کو یہ فلم بہت پسند آیا ہے" ــــــ سردار صاحب کہنے لگے "فلم تو خیر ایسا ہی ہے میں تو یہ دیکھنے آتا ہوں کہ گاڑی کسی دن لیٹ بھی ہوتی ہے یا نہیں، وہ کسی دن بھی لیٹ نہیں ہوئی"۔

اس طرح کے بے شمار لطیفے ہیں جو بلونت سنگھ مجھے کئی سال تک سُناتا رہا ــــــ اور میں نے اتنے لطیفے سُن لیے ہیں کہ اب مجھے بلونت سنگھ کے ساتھ لطیفے کا خیال آتا ہے اور لطیفے کے ساتھ بلونت سنگھ کا ــــــ بلونت سنگھ واقعی خود بھی ایک لطیفہ ہے ــــــ ایک ایسا

لطیفہ جو انسان کو مسحور بھی کر دیتا ہے اور محصور بھی!

لطیفہ گوئی اور لطیفہ سنجی کے ساتھ ساتھ جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی اس کی زندگی میں نظر آتی ہے وہ عورت اور اس کا ذکر ہے۔ شاید اپنے وقت کا تین چوتھائی حصہ وہ عورت کے خیال اور اس کے تذکرے میں ضرور صرف کرتا ہے۔ میں نے اس کے ذہن پر عورت کو مسلّط دیکھا ہے۔ وہ مجھے اس کے اعصاب پر سوار نظر آئی ہے۔ عورت کے ذکر کے بغیر اس کی کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ اور اس کی ہر بات کی تان اسی عورت کے ذکر پر جاکر ٹوٹتی ہے۔ عورت کا ذکر ہو تو اس کی کلی کلی کھل جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ جاتا ہے۔ اس پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیفیت ایک خاص وقت تک اسے ایک بدلا ہوا انسان بنائے رکھتی ہے — بلونت سنگھ عورت اور اس کے ذکر کا عاشق ہے۔ وہ عورت کا ذکر اور اس کی ہستی انسانی زندگی میں جو رنگ بھرتی ہے، اس کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتا ہے — اور اگر اس تذکرے اور بیان میں کوئی اور بھی شریک ہو جائے تو اس سے زیادہ بلونت سنگھ کو کوئی اور عزیز نہیں ہو سکتا۔ جو عورت کا ذکر کرے اور عورت کی ذات میں دلچسپی لے وہ بلونت سنگھ کا سب سے بڑا دوست ہے۔ — عورت کا ذکر چھڑ جائے تو بلونت سنگھ پر شعر کی دیوی اپنے شہپر پھیلا دیتی ہے۔ یوں اسے شعر و شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں لیکن جب عورت درمیان میں آجائے تو وہ شعریت میں ڈوب جاتا ہے اور بڑی شاعرانہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ عورت کو زندگی کی حسین ترین تخلیق ثابت کرنے کے لیے وہ کبھی اسے پھول سے تعبیر کرے گا، کبھی اسے آسمان کا ٹوٹا ہوا تارہ کہے گا — اور اس طرح کی بے شمار تشبیہیں اور استعارے اس کے ذہن سے نکل کر فضا میں بکھرتے جائیں گے۔ اور وہ اس ذکر سے ایک ایسی فضا قائم کر دے گا جس میں بد ذوق سے بد ذوق انسان کا گم ہو جانا بھی یقینی ہے۔ بلونت سنگھ کی قائم کی ہوئی اس فضا میں کھو کر ہر شخص اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ اس نے خود اپنے آپ

کو پالیا ہے۔ زندگی کی حلاوت اور شیرینی اسے محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں دور دور تک سرمستی اور سرخوشی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

لیکن عورت اور اس کی باتوں سے بلونت سنگھ کی یہ والہانہ وابستگی نری جذباتیت پر استوار نہیں ہے۔ بلونت سنگھ تو اس کی انسانی زندگی کی بڑی اہم بلکہ سب سے اہم حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی باتوں میں اس سلسلے کی ساری تفصیل اسی بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہے۔ یہی اس کا محور ہوتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے عورت کے ساتھ یہ والہانہ وابستگی اس کے یہاں خیال سے زیادہ عملی صورت میں رونما ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ جن راہوں پر گامزن ہوتا اور جن منزلوں میں قدم رکھتا ہے ہم ان سب کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

اس کی تفصیل اب میں بھلا آپ کو کیا بتاؤں!

بلونت سنگھ کے مزاج میں بڑی صاف گوئی اور بے باکی ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں نہیں رکھ سکتا۔ کسی چیز کو چھپا نہیں سکتا۔ اس کے دل کی بات ہمیشہ زبان پر آجاتی ہے — اور مجھ سے تو شاید اس نے کوئی بات بھی نہیں چھپائی ہے۔ جن حالات سے بھی وہ دوچار ہوا ہے، جو کچھ بھی اس پر بیتی ہے، زندگی میں اسے جن منزلوں سے بھی گزرنا پڑا ہے، ان سب کی تفصیل اس نے مجھے سُنا دی ہے — نجی اور ذاتی معاملات تک کو مجھ سے نہیں چھپایا ہے۔ اپنے معاشقوں تک کی ایسی ایسی داستانیں مجھے سُنائی ہیں کہ میں ان کو سُن کر دنگ رہ گیا ہوں — اور میں نے ان کو سُن کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس طرح کے معاشقوں کی دنیا میں وہی شخص قدم رکھ سکتا ہے جو صاف گو، نڈر، بے باک اور زندہ دل ہو — بلونت سنگھ کی شخصیت میں ان تمام خصوصیات کو میں نے یکجا دیکھا ہے — وہ انہیں خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

لیکن ان خصوصیات کے دوش بدوش میں نے اس کی شخصیت میں ایک ایسی سادگی اور معصومیت کی جھلک بھی دیکھی ہے جو بلونت سنگھ ہی کا حصّہ ہے۔ اس کے انداز میں، چال ڈھال میں، ہنسنے بولنے میں، ملنے جلنے میں، کھانے پینے میں، غرض یہ کہ اس کی ہر بات میں مجھے ایک سادگی اور معصومیت کی جھلک نظر آئی ہے — اِس کے موٹے تازے، لمبے تڑنگے اور بھاری بھرکم جسم کے پیچھے میں نے ہمیشہ ایک ایسے بچے کو دیکھا ہے جو ہر وہ بات کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جس کی اس کے دل میں لہر اُٹھتی ہے جو بات بات پر مچل جاتا ہے، جو اپنے دل کو نہیں مارتا اور جو کچھ بھی اس کے دل میں سما جائے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے — جس کو زندگی میں پیدا ہونے والی ہر بات پر حیرت ہوتی ہے، جو زندگی کے ایک ایک واقعہ پر حیران رہ جاتا ہے لیکن اس حیرانی کے باوجود جو زندگی کا شدید احساس رکھتا ہے، جسے زندگی کی ہر بات اور ہر پہلو سے محبت ہوتی ہے، جو اس کی مسرّتوں کو حاصل کرنے کے لئے اس کی شادمانیوں سے اپنے سینے کو بھر لینے کے لیے ہر گھڑی اور ہر لمحہ ہمکتا رہتا ہے یہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ بلونت سنگھ کی زندگی کا بھی یہی مقصد ہے — اس کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں ہے — لیکن اس کے لیے یہی سب کچھ ہے۔

میں نے بلونت سنگھ کو عقل کی باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس کے اندر مجھے علم کی پیاس بھی نظر آئی ہے۔ میں نے اس میں پڑھنے کا ایک جنون بھی پایا ہے۔ ہر روز کم از کم دو گھنٹے کتابوں کی دکانوں کا چکر لگانا اور اپنی پسند کی کتابوں کا خریدنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کناٹ پیلیس کی کتابوں کی دکانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بلونت سنگھ کو نہ جانتا ہو، جس سے بلونت سنگھ نے کتابیں نہ خریدی ہوں اور جس کے یہاں بلونت سنگھ کا حساب نہ کھلا ہوا ہو۔ دلّی کی شاید ہی کوئی ایسی لائبریری ہو جس تک اس نے پہنچنے کی کوشش نہ کی ہو۔ میرے پاس کالج میں نہ جانے کتنی بار وہ صرف کتابیں لینے کی غرض سے آیا ہے — اور مختلف موضوعات پر اس نے نہ جانے کتنی کتابیں حاصل کی ہیں، اور ان سب کو پڑھا ہے۔ میں نے اسکو پڑھتے

ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اسی انہماک اور خلوص کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے ـــــ لیکن وہ اس کے باوجود وہ عالم نہیں بن سکا ہے۔ اس کے یہاں وہ خشکی اور وہ سنجیدگی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو تبحر علمی سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ علمی تبحر کے خیال سے نہیں پڑھتا ـــ وہ عالم نہیں بننا چاہتا ـــ وہ تو زندگی کو سمجھنے کے لیے اس کے نشیب و فراز کو محسوس کرنے کے لیے، اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے لیے، اس کی شادمانیوں سے زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے پڑھتا ہے ـــــ اس کا پڑھنا ذریعہ ہے، مقصد نہیں ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں زندگی کا شدید احساس نظر آتا ہے، اس کو برتنے کی ہمہ گیر تمنا دکھائی دیتی ہے ـــــ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسی میں اس کی بڑائی کا راز مضمر ہے ـــــ اگر وہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں ایک فلسفی کا روپ اختیار کر لیتا تو یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوتی۔ پھر وہ زندگی کو محسوس نہ کر سکتا۔ اس کو برت نہ سکتا ـــ اس سے دل نہ لگا سکتا ـــ اور اس طرح اس کی وہ صلاحیتیں موت کی نیند سو جاتیں جو اس کی شخصیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اور جس کا اثر اس کے فن میں بھی جھلکتا ہے ـــ بلکہ جن سے اس کا فن عبارت ہے۔

بلونت سنگھ انسان ہے اور اسی لیے وہ انسانی زندگی کا فن کار ہے ـــ انسانی زندگی جو اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے عام طور پر 'پنجاب نگار' کہا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ "پنجاب نگار" ہے بھی ـــــ کیونکہ وہ خود پنجابی ہے اور اس نے پنجاب کی فضا میں سانس لی ہے وہ پنجاب کے ماحول میں پروان چڑھا ہے ـــ پنجاب سے اسے والہانہ دلبستگی اور مجنونانہ شیفتگی ہے اس لیے پنجاب کی ترجمانی کو زندگی کی ترجمانی سمجھتا ہے۔ پنجاب کا ذکر آئے تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ وہ حسین فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے، رنگین آسمانوں میں پرواز کرنے لگتا ہے، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ایک دن بات پنجاب پر چل نکلی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اس کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "پنجاب مجھے پسند ہے وہاں کی فضاؤں میں کتنی دلکشی ہے؛ وہاں کے ماحول میں کیسی دلآویزی ہے؛ وہاں کی ہواؤں میں کس درجہ رعنائی ہے؛ وہاں کے دریاؤں میں کتنا رومان ہے، وہاں کے پہاڑوں میں کس قدر رنگینی ہے؛ وہاں کے لوگ کتنے زندہ دل ہیں؛ وہاں کے مردوں میں کتنا شکوہ ہے؛ وہاں کی عورتوں میں کس بلا کا حُسن ہے؛ کشمیر میں تو لوگ خواہ مخواہ حُسن کو تلاش کرتے ہیں اور بیکار اس کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں، حُسن تو پنجاب میں ہے، اور پھر اس حُسن میں کتنی لطافت ہے، کس درجہ نفاست ہے؛ اور اس لطافت اور نفاست کے ساتھ اس میں کیسی طرح داری ہے؛ کس غضب کی توانائی ہے" تو اس پر رقّت سی طاری ہوگئی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اس کے دل میں اشکوں کی ایک لہر سی انگڑائیاں لینے لگی تھی، اس کے سینے میں اُداسی اور غم انگیزی کا ایک طوفان سا اُمڈنے لگا تھا اور رنج و مسرت کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ رقّت بھری آواز میں وہ دیر تک کچھ اس طرح کی باتیں کرتا رہا تھا کہ پنجاب کی سرزمین واقعی اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں حُسن ہے، دلکشی ہے، رنگینی ہے، رعنائی ہے، طرح داری ہے، توانائی ہے، زندگی ہے، زندہ دلی ہے، وہاں کی زمین سونا اُگلتی ہے، وہاں کی ہواؤں میں شراب کی تاثیر ہے۔ وہاں تو ہر شخص بغیر پئے مست رہتا ہے۔ نازنینانِ کشمیر کے حُسن کی تعریف میں تو یونہی زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے ہیں، حُسن تو گُل رخانِ پنجاب میں ہے۔ کیونکہ حُسن، صحت اور توانائی کا نام بھی ہے، جذب و شوق بھی اس کی خصوصیت ہے، رندی و سرمستی بھی اس کا وصف ہے ـــ اسی لیے پنجاب میں آج بھی ہیر اور رانجھا، سوہنی اور مہینوال، مرزا اور صاحباں کی کمی نہیں ہے۔ افسوس ہے اب وہ پنجاب نہیں رہا اب تو وہ "دو آب اور سہ آب" ہی رہ گیا ہے۔ پنجاب اب کہاں"؟

پنجاب اسی لیے تو اس کے فن کا موضوع ہے۔ اسی وجہ سے تو اس نے پنجاب سے پیار کی

کی ہے۔ زندگی کو اس نے پنجاب میں دیکھا ہے اور پنجاب میں اسے زندگی نظر آئی ہے۔ پنجاب اور زندگی اس کے نزدیک لازم و ملزوم ہیں اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس کی "پنجاب نگاری" میں زندگی ہے اور زندگی میں 'پنجاب نگاری'!

میں نے اسے چاہا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔ اس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے گزارے ہیں۔ اس کے ساتھ اَن گنت یادیں وابستہ ہیں، اور یہ یادیں میری زندگی کا اگر سب سے بڑا نہیں تو بہت بڑا سرمایہ ضرور ہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ اس کی دل موہ لینے والی شخصیت آج بھی میرے دل میں محمل نشین ہے۔ اس کے خیال سے میری دنیا میں آج بھی انجمن آرائی ہے۔ اس کے حسین تصور سے آج بھی بزمِ طرب آراستہ ہے اور اگرچہ حالات نے مجھے اس سے بہت دور کر دیا ہے، درمیان میں ایک آہنی دیوار سی حائل ہے لیکن اس کے باوجود وہ رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے ـــــ لیکن جذبۂ دل کی تاثیر اُلٹی ہی ہوتی ہے۔ آجکل اس "اندازِ محبوبی" اور طرزِ دلربائی" میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ ضرور اس میں کسی "جمالِ ہمنشیں" کا اثر ہو گا۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل اس کا خیال آتے ہی اس کی حسین یاد دھیمے سُروں میں یہ شعر کیوں گنگنانے لگتی ہے:-

ے خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میر صاحب

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ مشرقی پنجاب، دلّی اور مغربی یو۔پی سے مسلمانوں کے بے شمار لٹے پٹے خاندان شہر لاہور میں داخل ہو کر ایک نئے وطن میں از سر نو آباد ہوئے اور زلیشت کرنے کی جدوجہد میں سرگرداں تھے۔ جہاں جس کو سر چھپانے کی جگہ ملتی تھی وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ اگرچہ اس وقت لوگوں کو سکون نہیں تھا، اور آرام و آسائش نصیب نہیں تھی لیکن ماحول ہر اعتبار سے نہایت صحت مندانہ تھا۔ مادی اور کاروباری ذہنیت عام نہیں تھی۔ لوگوں کے پاس وقت بھی خاصا تھا۔ اس لیے آپس میں مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آتے تھے۔

ایسے ہی لوگوں میں ایک میر صاحب تھے۔ نام ان کا عترت حسین تھا۔ مغربی یو۔پی کے ضلع بلند شہر یا مظفر نگر کے کسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ جب فسادات نے یو۔پی میں بھی قیامت برپا کی تو کسی فوجی اسپشل میں بیٹھ کر لاہور آ گئے اور کرشن نگر میں ارجن روڈ پر قیام پذیر ہو گئے۔ اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا لی۔ احباب کا ایک اچھا خاصا حلقہ

قائم کیا اور اس طرح لاہور میں وقت گزارنے لگے۔ ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے لاہور کے مختلف حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ تفنن طبع کے طور پر لوگ ان کی باتیں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ منٹو صاحب نے ان کے بارے میں ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھ دیا جو لاہور کے کسی ہفتہ وار اخبار (غالباً نیرنگ لاہور) میں چھپ گیا اور اس طرح میر صاحب کی شہرت ایسی پھیلی کہ لوگ انہیں دور دور سے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔

میں بھی ان دنوں لاہور میں تازہ وارد تھا۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، ناصر کاظمی، انتظار حسین، محمد حسن عسکری اور حکیم حبیب اشعر وغیرہ کے ساتھ صحبتیں رہتی تھیں۔ منٹو صاحب سے بھی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں برائے تفنن طبع میر صاحب کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ جب میں نے ان کے بارے میں دلچسپ باتیں سُنیں تو میرے دل میں بھی اُن سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

ان دنوں میں اپنے ماموں زاد بھائی نصرت صاحب کے ساتھ مال روڈ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ان سے میر صاحب سے واقفیت تھی، اور وہ کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے کرشن نگر جاتے رہتے تھے۔ کیوں کہ وہ میر صاحب کے "حلقہ خاص" میں شامل تھے۔ یہ "حلقہ خاص" کیا تھا اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

قصہ مختصر یہ کہ ایک دن ہم لوگ میر صاحب سے ملنے کے لیے کرشن نگر پہنچے۔ میر صاحب ارجن روڈ والی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی دوکان سے نیچے آگئے۔ معانقہ کیا، اور اس طرح ملے جیسے برسوں کے تعلقات ہوں۔ دیر تک مزاج پوچھتے اور حالات دریافت کرتے رہے۔ دوکان کے سامنے سڑک پر دو کرسیاں پڑی تھیں، اُن پر بٹھایا خود دوکان کے اندر پردے کے پیچھے گئے۔ چائے بنائی اور نہایت نفاست اور سلیقے سے خوبصورت برتنوں میں چائے لے کر میر صاحب باہر آئے۔ بڑے شوق سے ہمیں چائے پلائی اور دیر تک، ہندوستان پاکستان، شعر و ادب اور تہذیب و معاشرت اور نہ

کن کن موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اب مجھے یاد بھی نہیں کہ کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔

اس ملاقات کے بعد ہی مجھے یہ خوش خبری سُنائی گئی کہ میں بھی میر صاحب کے حلقہ خاص میں شامل ہوں اور آنے والی بقر عید کے موقع پر ذبح ہونے والی گائے کی قربانی میں ایک حصہ دار میں بھی ہوں گا۔ میر صاحب نے یہ فیصلہ اتنی جلدی میں کیا اور یہ اعزاز مجھے اتنی سرعت سے بخشا کہ میرے لیے اس کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

کہنے لگے "ثواب تو گائے کی قربانی کرنے کا ہے۔ بڑا جانور ہے۔ بکرا تو بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا ثواب بھی کم ہے۔ پھر ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک گائے کی قربانی میں سات آدمی شریک ہو کر برابر کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ آسانی بھی ہوتی ہے۔" میں نے ذرا چھیڑنے کے خیال سے پوچھا "میر صاحب! کیا آج کل ہندوستان میں بھی گائے کی قربانی ہو سکتی ہے"؟

میر صاحب میرے اس سوال پر کچھ افسردہ سے ہوئے اور بولے "مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ پاکستان کو ہندوستان سے اس کے لیے لڑنا پڑے گا۔ آخر مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ سمجھے صاحب!

پھر تھوڑی دیر رک کر کہنے لگے "لیکن صاحب گائے کی قربانی اب بھی ہندوستان میں ہو گی۔ مسلمان بڑی شیر دل قوم ہے۔ بھلا گائے کی قربانی سے کیسے باز آ سکتی ہے۔ ہندوؤں سے اس کے لیے جھگڑا ہو گا۔ لوگ مارے جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں کو ہندو اس کام سے روک نہیں سکتے۔"

دیر تک میر صاحب گائے کی قربانی کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں یہ طے پایا کہ بقر عید کے روز نماز کے بعد ہم سب کرشن نگر میں میر صاحب کی طرف آئیں گے اور نہ صرف گائے کی قربانی کا منظر دیکھیں گے بلکہ پہلے اس کے گلے پر چھری بھی چلائیں گے۔

میر صاحب کی یہ دلچسپ باتیں سُن کر ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ چند

روز کے بعد بقر عید کا دن آگیا۔ ہم لوگ نماز ادا کرکے سیدھے کرشن نگر پہنچے تاکہ گائے کی قربانی کا منظر دیکھیں۔ کیوں کہ میر صاحب نے سختی سے تاکید کی تھی۔ اور اندیشہ اس بات کا تھا کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو میر صاحب کو ملال ہو گا، اور ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو جائیں۔

آج میر صاحب کا اہتمام دیکھنے والا تھا۔ وہ کچھ اس طرح مصروف نظر آرہے تھے جیسے ان کے یہاں کوئی شادی ہو اور وہ برات کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہوں۔

ہم لوگ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں بیٹھے ہوں گے۔ اس عرصے میں میر صاحب نے قربانی کا سارا ثواب حاصل کیا۔ گوشت بنوایا۔ دوستوں اور غریبوں کو حصے تقسیم کیے اور جب یہ سب کچھ ہو چکا تو معلوم ہوا کہ کھانا تیار ہے۔ خدا جانے یہ کھانا کہاں اور کس کس کے یہاں پکا تھا۔ کیوں کہ ارجن روڈ کے تقریباً تمام رہنے والے میر صاحب کے عقیدت مند تھے اور ان کے اس قسم کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کو وہ سب کے سب اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ بہر حال کھانا نہایت لذیذ تھا۔

کھانا کھا کر ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج ہم لوگوں نے میر صاحب کو اپنے صحیح رنگ میں دیکھا۔ جوش اور ولولے سے بھرپور کبھی کبھی وہ اپنے وطن کی بقر عید کے مناظر کو یاد کر کے اداس ضرور ہو جاتے تھے لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر کہتے "خیر اب ہم فاتح کی حیثیت سے وہاں جائیں گے تو پھر وہی ماحول پیدا کر لیں گے"۔

اور مجھے ان کی اس قسم کی باتوں سے بہت ہی لطف آیا۔

میر صاحب اس وقت اگرچہ بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے لیکن بوڑھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ادھیڑ عمر کا آدمی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک انداز طرح داری تھا۔ اور وہ اس انداز سے لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ درمیانہ قد، سڈول جسم، گول چہرہ، گندمی رنگ، داڑھی صاف لیکن ہٹلر کے انداز کی آدھی مونچھیں۔ ان سب نے مل کر ان کے اندر ایک جذب و کشش

پیدا کر دی تھی۔ سلیقے سے سلے ہوئے صاف ستھرے لباس میں وہ ایک بارعب انسان معلوم ہوتے تھے۔ گرج دار آواز نے اس رعب میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ بڑے پائنچوں کا لکھنوی انداز کا پاجامہ اس پر کڑھا ہوا کام دار کرتہ یا بغیر کالر کی سادہ یا دھاری دار قمیص، انگریزی بالوں پر سیاہ مخمل کی کشتی نما ٹوپی۔ ان سے میر صاحب پہچانے جاتے تھے۔ باہر نکلتے تو گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں سیاہ رنگ کی گرم شیروانی زیب تن کرتے، شان دار سی چھڑی ہاتھ میں لیتے اور اس انداز سے جہاں جی چاہتا وہاں پہنچ جاتے تھے۔

مرتے دم تک میر صاحب نے اپنی اس وضع اور انداز کو نہیں بدلا۔

اگرچہ میر صاحب نے مجھے بہت جلد اپنے "حلقہ خاص" میں شامل کر لیا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس کا صحیح علم نہ ہو سکا کہ میر صاحب رہتے کہاں ہیں۔ کرشن نگر میں ارجن روڈ پر ان کی چھوٹی سی دوکان ہی کو ان کی جائے قیام کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوکان کم اور احباب کے مل بیٹھنے، جمع ہونے اور گپ کرنے کی جگہ زیادہ تھی۔ دوکان تو محض برائے نام تھی۔ صرف سگریٹ کی کچھ ڈبیاں ایک چھوٹی سی الماری میں رکھی رہتی تھیں۔ بس اس دوکان میں یہی کاروبار ہوتا تھا۔ کوئی آیا تو سگریٹ خرید کر لے گیا۔ میر صاحب کو خرید و فروخت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دوکان کے تھڑے پر شان سے بیٹھے رہتے۔ اس تھڑے پر چاندنی کا فرش ہوتا۔ میر صاحب اپنے بیٹھنے کے لیے ایک چھوٹا سا گدا استعمال کرتے۔ کوئی خاص ملنے والا آتا تو وہ گدا اس کو پیش کر دیتے۔ کوئی حلقہ خاص سے متعلق ہوتا تو ان کے ساتھ تھڑے ہی پر بیٹھتا۔ ورنہ سڑک پر دو کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ ان پر بھی ملنے والے بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ گرمیوں میں شام کے وقت دوکان کے سامنے سڑک پر چھڑکاؤ ہوتا۔ کرسیوں کی تعداد آس پاس کے مکانوں سے حاصل کر کے بڑھا دی جاتی۔ بجلی کا پنکھا سامنے لگا دیا جاتا۔ میر صاحب ایسے موقع پر بیڑی کی جگہ حقے سے شوق فرماتے۔ دوکان کے برابر میں

ایک صاحب رہتے تھے جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ حقّے کا اہتمام ان کے سپرد تھا۔ تھڑے کے نیچے دوکان کے اندر ایک پردہ پڑا رہتا۔ وہ میر صاحب کا خلوت خانہ تھا۔ وہاں ایک لڑکا چائے کا اہتمام کرتا۔ ایک اور لڑکا اس چائے کے لیے تازہ دودھ لاتا، احبابِ خاص جمع ہو جاتے تو چائے کا دور چلتا۔ میر صاحب بڑے ہی سلیقے سے چائے بناتے اور نہایت محبت کے ساتھ احباب کو پیش کرتے۔ میر صاحب اچھی چائے کے شیدائی تھے۔ اچھی سے اچھی چائے لاتے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے تھے اور واقعی میر صاحب کی چائے بڑی ہی مزے دار ہوتی تھی۔

اس چھوٹی سی دوکان کی دیواروں اور دروازے پر سامنے کی طرف میر صاحب نے بعض عبارتیں نہایت اہتمام سے فریم کروا کے آویزاں کی تھیں۔ ایک تو خیر ان کے "حلقہ خاص" کی فہرست تھی جس کو انہوں نے کسی اچھے خوش نویس سے لکھوا کر اور فریم کروا کے سامنے آویزاں کیا تھا اس "حلقہ خاص" میں حضرت جگر مراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت احسان دانش، پروفیسر محمد حسن عسکری، راز مراد آبادی، انتظار حسین حکیم حبیب اشعر دہلوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین ناصر کاظمی اور اس خاکسار کے ناموں کے علاوہ کچھ سرکاری افسروں کے نام بھی تھے۔ ان ناموں کے نیچے اس طرح کا ایک نوٹ بھی لکھا تھا۔ کہ حلقہ خاص میں شامل ہونے کے لیے تین یا چار ممبروں کی سفارش ضروری ہے۔

اس حلقہ خاص میں سے بیشتر لوگ یا تو میر صاحب کے پاس آتے تھے یا کسی نہ کسی تقریب کے بہانے لائے جاتے تھے۔ یا پھر میر صاحب خود ان کے پاس جاتے تھے۔ اس طرح میر صاحب کا رابطہ ان لوگوں کے ساتھ قائم رہتا تھا۔ اور میر صاحب قابلِ داد ہیں کہ انہوں نے مرتے دم تک کسی نہ کسی طرح اپنے حلقہ خاص کے لوگوں سے ایک رابطہ قائم رکھا۔

حلقہ خاص کی اس فہرست کے علاوہ میر صاحب کی اس دوکان پر بعض عجیب و

غریب عبارتوں بھی خوش خط لکھوا کر اور فریم کروا کے آویزاں کی گئی تھیں۔ مثلاً ایک عبارت کچھ اس طرح کی تھی۔

"یہاں ریلوے کا ٹائم ٹیبل مل سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے کسی کو جگانا نہیں چاہیئے مذہب کے لحاظ سے بھی کسی کو جگانا مناسب نہیں ہے۔"

ایک اور عبارت کچھ اس قسم کی تھی۔

"یہاں پر مذہبی گفتگو نہ کیجئے۔ اس سے تعلقات کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اپنے عقائد اپنے تک رکھیئے۔ مذہب بھی یہی سکھاتا ہے۔"

اس قسم کی چار پانچ عبارتیں میر صاحب نے خوش خط لکھوا کر اور فریم کروا کر دوکان میں اس طرح آویزاں کر رکھی تھیں کہ ان پر ہر شخص کی نظر پڑتی تھی۔

میں نے پہلی دفعہ ان عبارتوں کو پڑھا تو ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ "شاید" حلقۂ خاص میں شامل ہونے کی وجہ سے میں اس کا عادی ہو گیا اور میر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو پر ہنسنے کے بجائے، ان کی معصومیت، سادگی اور سادہ لوحی پر مجھے پیار آنے لگا۔

میر صاحب کو ملنے اور محفلیں جمانے کا بڑا شوق تھا۔ کوئی شاعر یا ادیب لاہور میں آیا، اور میر صاحب نے اس کے اعزاز میں چائے یا کھانے کی دعوت دے دی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اس کے انتظار میں رہتے تھے کہ ایسی کسی تقریب کی کوئی صورت پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تقریبات میر صاحب کی اس چھوٹی سی دوکان میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے اس کا اہتمام ارجن روڈ پر واقع کئی مکانوں میں ہوتا تھا۔ کبھی اختر صاحب کے ہاں جو میر صاحب کی دوکان کے سامنے رہتے تھے، کبھی متین صاحب کے ہاں، کبھی شفیق صاحب کے مکان پر، اور کبھی خورشید اکبر صاحب کی جائے قیام پر، میر صاحب

ان مکانوں کو اپنے مکان سمجھتے تھے، اور ان کے مکین بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے مکان میر صاحب کے مکان نہیں ہیں۔ یہیں کھانے پینے یا چائے کا اہتمام ہوتا اور نہایت دھوم دھام سے تقریبات منعقد ہوتیں۔ کبھی کبھی اس قسم کی تقریبات مشاعروں کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھیں۔ سال میں اس قسم کے دو تین مشاعرے میر صاحب ضرور کرتے تھے۔ لاہور کا شاید ہی کوئی ایسا مشہور شاعر ہو جس کو میر صاحب نے ان مشاعروں میں نہ کھینچ بلایا ہو۔

شروع شروع میں میر صاحب جگر صاحب کے عاشق تھے، اور کسی اور کو ان سے بڑا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ جگر صاحب کا مستقل قیام تو ہندوستان میں تھا لیکن وہ زیادہ وقت پاکستان کے مختلف شہروں کراچی، پنڈی، مری اور لاہور میں گزارتے تھے جب وہ لاہور آتے تو گویا میر صاحب کے لیے عید آجاتی۔ چوبیس گھنٹے میر صاحب ان کے ساتھ رہتے۔ جگر صاحب کا قیام ان دنوں لاہور میں ڈاکٹر عبدالعزیز خان صاحب کے یہاں کوئین روڈ پر رہتا تھا۔ جب بھی میں ان سے وہاں ملنے گیا تو وہاں میر صاحب کو ضرور پایا۔ جگر صاحب کے اعزاز میں میر صاحب کئی تقریبات کا اہتمام کرتے اور جگر صاحب کی وضعداری بھی قابل دید تھی کہ وہ میر صاحب کی ہر بات مانتے اور میر صاحب جہاں چاہتے وہ جانے کے لیے تیار ہو جاتے۔

جگر صاحب کی شخصیت کے ساتھ میر صاحب کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی دوکان کے خلوت خانے میں جگر صاحب کی ایک بہت بڑی سی تصویر کسی اعلٰے درجے کے آرٹسٹ سے بنوا کر اپنے سامنے آویزاں کر رکھی تھی۔ اس تصویر کے سامنے وہ نہایت احترام کے ساتھ بیٹھتے تھے اور اس کو دیکھ کر ملنے والوں سے جگر صاحب کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کی گفتگو کا سب سے اہم موضوع جگر صاحب کی شخصیت تھی۔

جوش صاحب اس وقت تک مستقل طور پر پاکستان نہیں آئے تھے۔ عارضی طور پر کبھی آجاتے تھے۔ میر صاحب کو کسٹم والوں سے ان کی آمد کا علم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ جوش صاحب کے پاس بھی پہنچ جاتے تھے۔ شروع شروع میں جوش صاحب سے ان کے تعلقات زیادہ گہرے نہیں تھے لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ ہوا کہ جوش صاحب لاہور آنے سے قبل میر صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے۔ اور جب واپس چلے جاتے تھے تو میر صاحب کو خط لکھتے تھے۔ بلکہ کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ وہ لاہور میں میر صاحب کے مہمان ہوئے۔ میر صاحب انہیں کبھی خورشید اکبر کے ہاں، کبھی اختر صاحب کے ہاں، کبھی کسی اور دوست کے ہاں ٹھہراتے اور ہر وقت ان کے ساتھ رہتے۔

میر صاحب کو یوں تو ہر شاعر سے دلچسپی تھی اور وہ اس کی آؤ بھگت میں پیش پیش رہتے تھے لیکن جگر صاحب اور جوش صاحب کے وہ شیدائی تھے۔ شعر کا ذوق نہایت ستھرا پایا تھا۔ سخن فہمی کی صلاحیتیں بھی ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔ بعض اشعار بھی انہیں یاد ہو جاتے تھے، اور موقع محل کے لحاظ سے وہ ان کو سناتے بھی تھے اور مشاعرے بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ فرش بچھاتے، شمع جلاتے تھے، گلدانوں میں پھول سجاتے تھے۔ اگر بتیاں سلگاتے تھے، غرض ان کے مشاعروں میں بڑا ہی دلکش اور دلآویز ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ شاعر بھی، خدا جانے کس طرح ان کے مشاعروں میں کھنچ کر آجاتے تھے۔ رات گئے تک ان کی اس قسم کی محفلیں جاری رہتی تھیں۔ مشاعرے کی ان محفلوں میں میر صاحب صرف شاعروں کا ہی نہیں، شریک ہونے والے سامعین کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔

شعر و شاعری سے ان کی یہ دلچسپی اور شاعروں سے ان کی یہ دوستی میرے لیے ہمیشہ حیران کن رہی۔ وہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔ بہ مشکل دستخط کر سکتے تھے، لیکن خدا جانے ان کے پاس کیا جادو تھا کہ وہ شاعروں اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتے تھے اور ان سب سے ان کی ملاقات بہت جلد دوستی کی سرحدوں

میں داخل ہو جاتی تھی۔

میں نے بعض بڑے ہی سیلانی مزاج لوگوں کو میر صاحب کی اس چھوٹی سی دوکان کے خلوت خانے میں دیکھا ہے۔

ایک دن پہنچا تو دیکھا کہ اندر ناصر کاظمی کی آواز آ رہی ہے۔ میں نے آواز دی۔ میر صاحب باہر نکلے، کہنے لگے "آیئے۔ ناصر کاظمی بیٹھے ہیں۔ مزے دار باتیں ہو رہی ہیں"۔

میں داخل ہوا تو دیکھا واقعی ناصر کاظمی موجود ہیں۔ چائے کی ٹرے سامنے رکھی ہے۔ اسٹو جل رہا ہے، اور اس پر دودھ گرم ہو رہا ہے۔

ناصر کاظمی کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا اور دیر تک ہم لوگ میر صاحب کے ساتھ دلچسپ باتیں کرتے رہے۔

ایک دن میں میر صاحب کی دوکان کی طرف سے گذرا تو دیکھا حکیم حبیب اشعر سامنے بیٹھے ہیں اور میر صاحب ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں۔

مجھے دیکھ کر میر صاحب کہنے لگے "صاحب اب اندر تشریف لے آیئے"۔

میں اور حبیب اشعر مرحوم دونوں اندر جا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے چائے تیار کی اور دیر تک ہمارے ساتھ مصروف گفتگو رہے۔

ایک دن اسی طرح انتظار حسین کو میر صاحب کے خلوت خانے میں بیٹھے ہوئے دیکھا اب میں سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اس قسم کے سیلانی مزاج لوگ کس طرح میر صاحب کے اس حجرے میں جا کر بیٹھتے تھے۔

بات یہ ہے کہ میر صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، اور اس انجمن میں بعض لوگوں کی سیلانی مزاجی کو بھی پناہ مل جاتی تھی۔ میر صاحب میں وضعداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ خلوص اور محبت کا ایک مجسمہ تھے۔ اسی لیے ان کی شخصیت ایسے لوگوں کے دامن دل کو بھی اپنی طرف کھینچتی تھی۔

میر صاحب عید بقر عید بڑی شان سے مناتے تھے۔ ان کی وضعداری ان مواقع پر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عید کے موقع پر ہمیشہ اہتمام کے ساتھ کارڈ چھپواتے۔ اس کارڈ پران کی ایک خاص تصویر ہوتی۔ اس کے نیچے جگر صاحب کا یہ ایک مصرعہ ہوتا تھا ؎

محبت زندگی ہی زندگی ہے

یہ کارڈ "حلقہ خاص" کے لوگوں کے علاوہ شہر کے خاص خاص لوگوں اور افسروں کو بھی بھیجے جاتے اور اس اہتمام سے پوسٹ کیے جاتے کہ عید سے ایک دن قبل مل جاتے۔

یہ کارڈ میر صاحب کے اظہار محبت اور تجدید ملاقات کی ایک علامت تھا۔ میر صاحب اس کے ذریعے ہر سال اپنے تعلقات کو تازہ تر رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور مجھے تو اس مخصوص قسم کے کارڈ کو دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے میر صاحب خود آگئے ہیں۔ اور ان سے بھرپور ملاقات ہوگئی ہے۔ اپنی تصویر چھپوا کر لوگوں کو تقسیم کرنا بظاہر خود نمائی کو ظاہر کرتا ہے لیکن میر صاحب کے اس عمل میں خود نمائی کے برخلاف سادہ لوحی اور معصومیت، اخلاص اور محبت کے پہلو زیادہ نمایاں تھے۔

میر صاحب کا زیادہ وقت احباب کی صحبتوں اور خدمت خلق کے کاموں میں گزرتا تھا۔ اسی وجہ سے کاروبار میں انہیں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوسکی۔ یوں انہوں نے کئی کاروبار کیے۔ ارجن روڈ پر سگریٹ کی دوکان کھولی، سگریٹ کی بڑی ایجنسی بھی لی، کسٹم اور پاسپورٹ کے دفتروں میں کنٹین بھی کھولے، ٹھیکے بھی لیے، لیکن ان گاڑیوں کو وہ اپنے مزاج کی مخصوص کیفیت کی وجہ سے چلا نہ سکے اور ہمیشہ زمانے کی ستم گاری اور سفاکی کے شکوہ سنج ہی رہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ انہیں کاروبار نہیں آتا تھا۔ وہ اس دنیا کے انسان نہیں تھے۔ انہیں تو صرف مخصوص لوگوں سے ملنا جلنا آتا تھا۔ وہ تو احباب کی صحبتوں میں اچھا وقت گزارنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ کاروبار کے لیے وقت سکون اور بنیے کا مزاج کہاں سے لاتے ؟

میر صاحب مہینے میں ایک دو بار میرے پاس ضرور آتے تھے۔ایک دو دفعہ میں بھی ان کے ہاں ضرور جاتا تھا مصروفیت کی وجہ سے اس معمول میں کبھی کبھی جب فرق پڑتا تو میر صاحب فون کرتے اور کہتے۔

"میں میر صاحب بول رہا ہوں۔ ملاقات نہیں ہوئی۔اس لیے سوچا ٹیلی فون سے خیریت معلوم کروں"۔

اور وہ نہ صرف میری بلکہ گھر والوں کی خیریت معلوم کرتے۔کالج کے حالات پوچھتے جگر صاحب اور جوش صاحب کی دو چار باتیں کرتے۔ان کے آنے کی خوش خبری سناتے یا نہ آنے کا شکوہ کرتے۔ دوسرے احباب کا ذکر کرتے۔جن احباب کی خیریت معلوم نہ ہو ان کی خیریت پوچھتے۔

گزشتہ چند سال سے میر صاحب کی صحت خراب ہو گئی تھی۔وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔تنفس کی تکلیف تھی۔کمزور ہو گئے تھے۔کمر کسی قدر جھک گئی تھی۔لیکن اس کے باوجود وہ ملنے جلنے کے معمولات میں کمی نہیں آنے دیتے تھے۔کسی نہ کسی طرح چھڑی ٹیکتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔سانس ہر وقت پھولی رہتی تھی اور چلنے سے تو بعض اوقات اکھڑ سی جاتی تھی۔

کوئی ڈیڑھ دو سال ہوئے میر صاحب سے میری آخری ملاقات ہوئی۔میں سہ پہر کے وقت گھر پر بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

یہ میر صاحب کا فون تھا۔

بولے! "میں میر صاحب بول رہا ہوں۔کئی دفعہ آپ کو فون کر چکا ہوں۔جوش صاحب آ گئے ہیں۔آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ذیشان مرزا کے ہاں حسن آباد میں ٹھہرے ہیں۔کل پرسوں تک ہاشمی صاحب کے ہاں پوسٹل کالونی میں منتقل ہو جائیں گے۔ان لوگوں کا اصرار ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔لیکن میں جوش صاحب کے ساتھ ہوں۔جب تک

وہ رہیں گے میں شب و روز ان کے ساتھ رہوں گا۔ آپ شام کو ضرور آیئے۔ جوش صاحب اور ہم سب آپ کا انتظار کریں گے۔"

میں شام کو ذیشان مرزا کے ہاں پہنچا۔ جوش صاحب سے ملاقات ہوئی میر صاحب بھی موجود تھے۔ لیکن ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانستے تھے، اور کھانستے کھانستے ان کی سانس رک جاتی تھی۔ لیکن اس عالم میں بھی جوش صاحب کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے ان کی سرگرمی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ میں نے انہیں مصروف ہی دیکھا۔

جوش صاحب ان کو چھیڑتے اور ان پر فقرے کستے تھے اور میر صاحب ان کا جواب ایک لطیف سی مسکراہٹ سے دیتے تھے۔

یہ میر صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد اگست کے مہینے میں، موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لیے میں چند ہفتے کے لیے کراچی چلا گیا۔ واپس آیا تو یہ خبر ملی کہ میر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جب بھی میر صاحب کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ایسی رنگا رنگ اور پُرکار شخصیت کے لوگ اب پیدا نہیں ہوں گے اور اُن کی شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ ہمیشہ آنکھیں ترستی رہیں گی۔

مطبوعات

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اقبالیات

۱- جشن نامۂ اقبال (اردو)
۲- جشن نامۂ اقبال (انگریزی)
۳- اورنٹیل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو)
۴- اورنٹیل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی)
۵- اقبال کی اردو نثر
۶- اقبال —— احوال و افکار
۷- جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیر طبع)
۸- اقبال کی غزل (زیر طبع)
۹- منظومات اقبال (زیر طبع)
۱۰- اقبال کا فن (زیر طبع)

ادبی دریافت

(نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

۱۱- شکنتلا مؤلفہ مرزا کاظم علی خان (مع مقدمہ)
۱۲- ہفت گلشن مؤلفہ مظہر علی خان ولا (مع مقدمہ)
۱۳- مادھونل اور کام کندلا مولفہ مظہر علی خان ولا (مع مقدمہ)
۱۴- دیوان ولا مؤلفہ مظہر علی خان ولا (مع مقدمہ)
۱۵- گلزار چین مؤلفہ خلیل علی خان اشک (مع مقدمہ)
۱۶- رسالۂ کائنات مؤلفہ خلیل علی خان اشک (مع مقدمہ)
۱۷- شکوۂ فرنگ مؤلفہ آغا حجو شرف (مع مقدمہ)
۱۸- چار گلشن مولفہ بینی نارائن جہاں (مع مقدمہ)
۱۹- دیوان مبتلا مولفہ عبداللہ خان مبتلا (مع مقدمہ)
۲۰- دیوان حیدری مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۱- حیدری مولفہ سید حیدر بخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۲- مختصر کہانیاں مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۳- تذکرۂ گلشنِ ہند سید حیدر بخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۴- گلزار دانش (دفتر اول) مؤلفہ سید حیدربخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۵- گلزار دانش (دفتر دوم) مؤلفہ سید حیدربخش حیدری (مع مقدمہ)
۲۶- مرقع مخلص مؤلفہ آنند رام مخلص (مع مقدمہ و حواشی)

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادب و تنقید ، ۸۸ - این ، سمن آباد ، لاہور